اقبال اور بمبئی

(روزنامہ خلافت، بمبئی کے حوالے سے)

پروفیسر عبدالستار دلوی

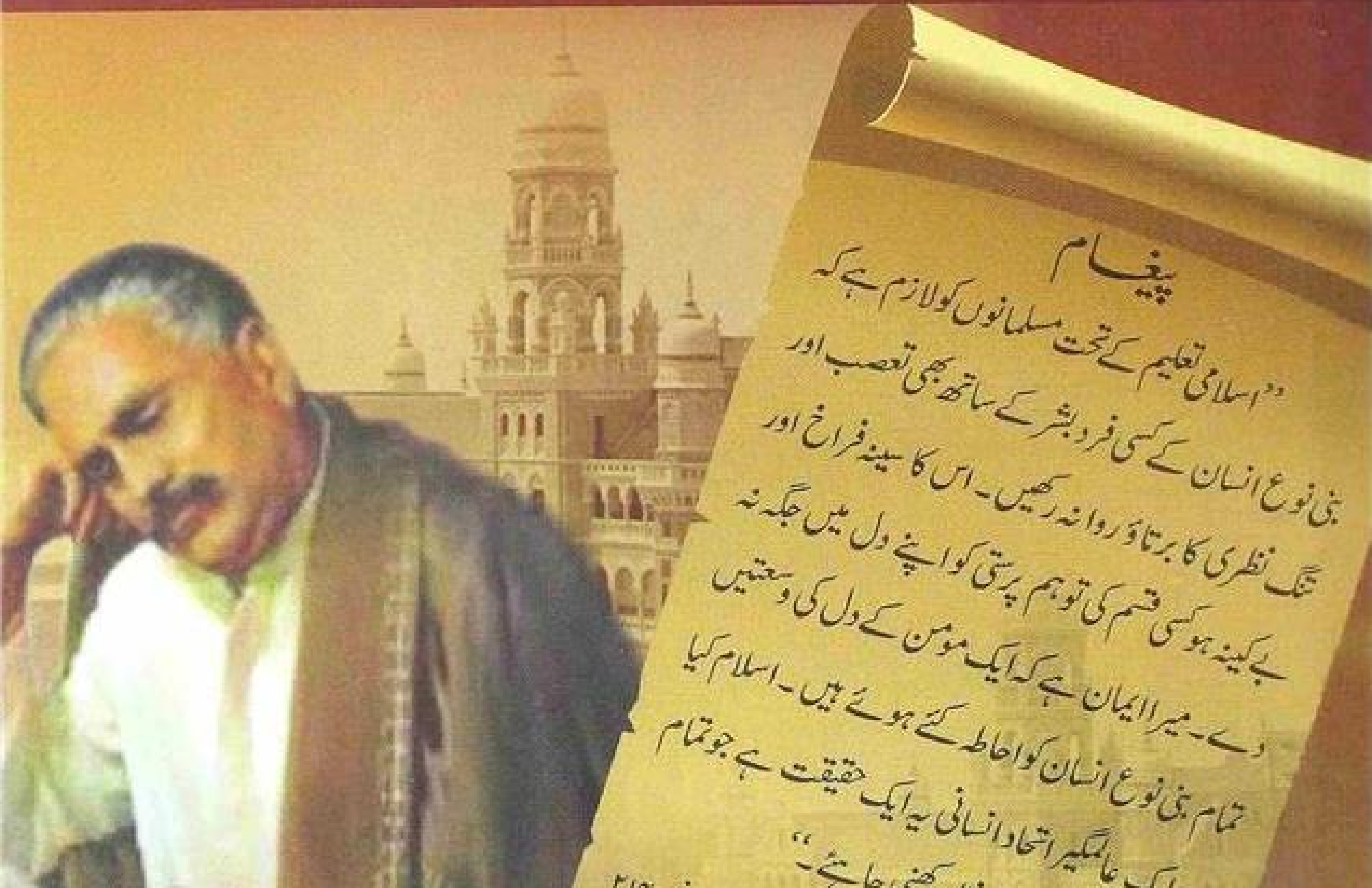

انجمنِ اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی

۹۲/ دادا بھائی نوروجی روڈ، ممبئی-۴۰۰۰۰۱

اقبال اور بمبئی

(روزنامہ خلافت، بمبئی کے حوالے سے)

اور

دیگر مضامین

پروفیسر عبدالستّار دلوی

اقبال اور بمبئی

(روزنامہ خلافت، بمبئی کے حوالے سے)

اور

دیگر مضامین

پروفیسر عبدالستّار دلوی

Symbol of Secularism &
National Integration

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی

۲۰۱۲ء

یہ کتاب اردو سافٹ ویئر ان پیج پروفیشنل کے اوریجنل ورژن میں ٹائپ کی گئی ہے۔

انجمن اسلام پبلیکیشنز سیریز (جدید) : ۱

©جملہ حقوق بحق پروفیسر عبدالستار دلوی

Iqbal Aur Bambai (Iqbal and Bombay)
by : Prof. Abdus Sattar Dalvi
Published by : Anjuaman-i-Islam Urdu Research Institute, Mumbai
Published in : 2012 - Price : Rs. 250/-

نام کتاب : اقبال اور بمبئی (مجموعۂ مضامین)

مصنف : پروفیسر عبدالستار دلوی

پتہ : الہلال، باندرہ ریکلی میشن، باندرہ، ممبئی۔۵۰

فون: 91-8454845552

ناشر : انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی
انجمن اسلام کمپلیکس، ڈی. این. روڈ، ممبئی۔۱

اشاعت : نومبر ۲۰۱۲ء

سرِ ورق : جاوید یوسف

کمپیوگرافی وطباعت : غزالی ٹائپ سیٹرس اینڈ پرنٹرس، ممبئی
contact.ghazali@gmail.com

قیمت : ۲۵۰/روپے

ملنے کے پتے ۱۔ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی
انجمن اسلام کمپلیکس، دادا بھائی نوروجی روڈ، ممبئی۔۴۰۰۰۰۱

۲۔ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ
پرنسس بلڈنگ، ابراہیم رحمت اللہ روڈ، ممبئی۔۳

۳۔ نئی کتاب پبلشرز
اوکھلا مین، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵

COMPLIMENTARY BOOK
National Council for Promotion
of Urdu Language
New Delhi

مشفق و محترم

مشہور دانشور، محقق اور ماہرِ قانون

مرحوم پروفیسر آصف علی اصغر فیضی

اور

مشہور رہنما اور ماہرِ تعلیم

مرحوم معین الدین حارث

(سابق صدر انجمنِ اسلام، ممبئی)

کے نام

جنہیں علامہ اقبال سے ملاقات کا شرف حاصل تھا۔

دُرویش خدامست، نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلّی، نہ صفاہان، نہ سمرقند
(اقبالؔ)

فہرست

ابتدائیہ	ڈاکٹر ظہیر قاضی	۹
پیش لفظ	پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی	۱۱
مقدمہ	پروفیسر عبدالستار دلوی	۱۳
حصہ اوّل	۱۔ اقبال اور بمبئی	۱۷
	۲۔ اقبال کی بمبئی میں آمد اور مسلمانوں کے نام پیغام	۳۳
	۳۔ علامہ اقبال، اسلام اور ملوکیت	۴۰
	۴۔ اقبال: ایشیا کے ملک الشعراء	۴۵
	۵۔ ھسپانیہ میں علامہ اقبال کے مشاہدات	۵۵
	۶۔ تیسری گول میز کانفرنس، لکھنؤ مسلم کانفرنس اور اقبال	۶۰
	۷۔ اقبال اور عطیہ بیگم فیضی	۷۲
	۸۔ اقبال کا ایک غیر مطبوعہ خط	۹۱
	۹۔ ترانۂ ہندی کے سو سال	۱۰۴
حصہ دوّم	۱۰۔ مہاتما گاندھی، اردو اور اقبال	۱۱۳
	۱۱۔ مصر میں اردو اور اقبال	۱۲۷
	۱۲۔ اقبال اور احمد شوق کے یہاں تاریخی حسیت	۱۴۲
ضمیمہ	۱۳۔ علامہ اقبال بمبئی میں از محی الدین غازی اجمیری	۱۴۷
	۱۴۔ اقبال کی زندگی کے چند گوشے...... از: محی الدین غازی اجمیری	۱۵۵

ابتدائیہ

ڈاکٹر ظہیر قاضی
(صدر انجمن اسلام، ممبئی)

انجمن اسلام مسلمانان ممبئی کا ممتاز تعلیمی ادارہ ہے جو جسٹس بدرالدین طیب جی اور ناخدا محمد علی روگھے (دوّم) کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے۔ یہ ادارہ ۱۸۷۴ء میں قائم کیا گیا۔ اس کا بنیادی مقصد مسلمانان ممبئی میں ثانوی تعلیم کا فروغ تھا۔ اس کے ابتدائی زمانے میں جو بزرگ اس سے متعلق ومنسلک تھے ان میں جسٹس بدرالدین طیب جی اور ناخدا محمد علی روگھے کے علاوہ منشی غلام محمد اور محی الدین دلوی (اولین دو سیکریٹری) قمرالدین طیب جی اور عبداللہ دھرمسی کے نام بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ عبداللہ دھرمسی کے زمانے میں ۱۸۹۷ء میں جب کہ وہ انجمن اسلام کے سیکریٹری تھے۔ انجمن اسلام ہائی اسکول کی عالی شان عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ یہ پرشکوہ عمارت اپنے اسلاف کی انتھک کوششوں اور تعلیمی مقصد سے لگن کی ایک مثالی یادگار ہے جسے ممبئی میں Heritage Building ہونے کا شرف حاصل ہے۔

انجمن اسلام نے اپنی شاندار تاریخی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے بعد کے زمانے میں بھی اسے قائم رکھا اور عصری ضروریات کے ساتھ اپنے کاموں میں توسیع کی۔ لڑکوں کی تعلیم

کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کی تعلیم پر بھی توجہ کی، پھر اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے نام سے ایک تحقیقی ادارہ قائم کیا جو مسلمانوں کی لسانی، ادبی اور تہذیبی شناخت کی ایک علامت ہے۔ اس سلسلے میں انجمن اسلام کے سابق صدر جناب سیف طیب جی اور ان کے رفقا ڈاکٹر محمد بذل الرحمن، پروفیسر نجیب اشرف ندوی، پروفیسر محمد ابراہیم ڈار اور پروفیسر آصف اے اے فیضی کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

ماضی میں ادارے کے ڈائرکٹر پروفیسر نجیب اشرف ندوی، ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی اور ادارے کے رفیق جناب عبدالرزاق قریشی کی اعلیٰ تحقیقی کاوشیں علمی دنیا کے سامنے پیش کرنے کا شرف انجمن اسلام کو حاصل رہا ہے۔ جس کی علمی دنیا نے بڑی پذیرائی کی یہ کتابیں حوالہ جاتی کتابوں کے طور پر مختلف یونیورسٹیوں میں شامل نصاب رہی ہیں۔

''اقبال اور بمبئی'' ادارہ کے اعزازی ڈائرکٹر اور مشہور محقق اور ماہر لسانیات پروفیسر عبدالستار دلوی کی کتاب پیش کرتے ہوئے انجمن اسلام خوشی محسوس کر رہا ہے۔ یہ مضامین پروفیسر دلوی نے عالمی شہرت یافتہ شاعر اور مفکر علامہ اقبال کے بمبئی کے قیام کے حوالے سے تحریر کیے ہیں۔ یہ گوشہ حیاتِ اقبال کا ایک نایاب پہلو ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس کتاب کی اشاعت سے اقبالیات میں گرانقدر اضافہ ہوگا۔ انشاء اللہ انجمن اسلام آئندہ بھی علمی، تحقیقی اور ادبی کتابیں پیش کرتا رہے گا۔

ممبئی

۲۱ر فروری ۲۰۱۲ء

ظہیر قاضی

(صدر انجمنِ اسلام، ممبئی)

پیش لفظ

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی
(صدر انجمن ترقی اردو ہند و سابق چیئر مین اسکول آف لینگویجز،
جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی)

اقبال ان شخصیتوں میں ہیں جن کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی خواہش بڑھتی ہی جائے تو کوئی حیرت کی بات نہیں۔ ان کی شاعری ہمارے جذبہ و احساس کی دنیا میں کچھ اس طرح سمائی ہوئی ہے کہ آج ہم شاید کسی لمحے بھی اس کے اثر سے باہر نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے اپنے عہد اور اپنے بعد آنے والوں کے طرزِ فکر کو ڈھالنے میں بڑا حصہ لیا ہے۔ اُن کے عہد کے سماجی اور سیاسی تلاطم میں بے شمار پُر پیچ سوالات اُجاگر ہوئے ہیں۔ جن کو سمجھنے اور حل کرنے کے مراحل سے گزرنے اور نئے مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لیے جس ذہنی جرأت اور حوصلے کی ضرورت ہے اسے عیاں کرنے کے لیے اقبال نے جو زبان اور انداز اظہار وضع کیا وہ منفرد ہے۔ مذاہب اور تہذیب کی تاریخ کے پیدا کیے ہوئے مسائل مشرق و مغرب کی کشمکش، آنے والے زمانوں کے تقاضوں سے نباہ کرنے کی قوت و عزم غرض کہ بیسویں صدی میں تعمیر و تخریب کے درمیان پنپتی ہوئی اور ہر لمحہ ایک نئی شکل اختیار کرتی ہوئی

دنیا میں اگر بہ یک وقت ساتھ دینے والے اور رہنمائی کرنے والے عناصر ظاہر ہوئے تو وہ صرف اقبال کی شاعری کی صورت میں ہمیں ملتے ہیں۔ چنانچہ ان کی زندگی اور ذات سے متعلق تجسس آج بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ اس کا ایک پہلو ملک اور دنیا کے مختلف خطوں میں اُن کے سفر اور قیام اور دانشوروں، عالموں اور عام لوگوں کے تبادلۂ خیال سے ان کے ذہن اور زندگی نے جو اثرات لیے اور دوسروں کو خود انہوں نے جس طرح متاثر کیا اس سے متعلق یادداشتیں، دستاویزیں اور ان کی زندگی کے متعدد واقعات و حادثات سے متعلق حقائق دریافت کر کے شایع کرنا ایک اہم فریضہ ہے۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس سلسلے میں پروفیسر عبدالستار دلوی نے ممبئی سے اقبال کے تعلق کے بارے میں تحقیق کی ہے جس میں بہت کچھ وہ ہے جو اب تک لوگوں کو متوجہ نہیں کرسکا، اس معلومات کے ذریعے اُن کی نجی اور تخلیقی زندگی کی نشوونما سے متعلق کچھ کڑیاں مل جائیں گی۔ پروفیسر عبدالستار دلوی نے پہلے بھی اقبال کی شاعری، زندگی اور ان کے کلام کے تراجم پر اہم کتابیں شائع کی ہیں وہ اردو کے معروف مستند محقق اور ماہر لسانیات ہیں مگر اُن کی علمی دلچسپیوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اردو اور مراٹھی کے تعلق سے بھی ان کے تحریریں اور تراجم اہل علم قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی یہ کتاب اقبال سے دلچسپی رکھنے والوں کو متاثر کرے گی۔

صدیق الرحمن قدوائی

مقدمہ

اقبال اردو اور فارسی کے ممتاز ترین شاعر تھے۔ ان کی شاعری متنوع موضوعات پر محیط ہے۔ فلسفۂ خودی، فلسفۂ عشق، نظریۂ زندگی، حب الوطنی اور کسی حد تک ان کے سیاسی نظریات اور تہذیبی شعور ان کی شاعری میں رچا بسا ہے۔ اقبال جتنے عظیم اور مقبول شاعر ہیں، اسی طرح اردو شعر وادب میں ایک نزاعی ہالہ بھی ان کے گرد پھیلا ہوا ہے۔ وہ مشرق اور مغرب دونوں کے ثنا خواں بھی ہیں اور ناقد بھی۔ وہ فطرت نگار بھی ہیں اور فلسفی بھی۔ ہمارے ادبی ناقدین نے بحیثیت مجموعی اقبال کا مطالعہ ایک فلسفی ہی کی حیثیت سے کیا ہے اور اکثر ان کی شاعرانہ حیثیت پر اظہارِ خیال کم ہوا ہے، تاہم ان کی شاعرانہ حیثیت بھی ان کی فلسفیانہ حیثیت سے کم نہیں ہے۔ اردو میں غالب اور اقبال ادبی ناقدین کا موضوع بحث رہے ہیں۔ ان پر بے شمار کتابیں لکھی گئیں ہیں، مگر ان کے مطالعے کے بے شمار پہلو اور حیات کے کئی گوشے اب بھی تشنۂ تحقیق ہیں اور محققین اور ناقدین کو مطالعے کے لئے نئے پہلو مل بھی جاتے ہیں۔ بڑی شاعری اور بڑے شاعر کثیر الجہات ہوتے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ہی ساتھ ان کی

عصری معنویت قاری کے لئے دلچسپی کا موضوع بن جاتی ہے۔ پرانے اخبارات و رسائل میں ان کی نگارشات کی اشاعت، ان کی فکر کی نئی جہتیں اور نئے زاویۂ نظر پر سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ جب حالات اور زمانے کے ساتھ ساتھ یہ حجابات اٹھتے ہیں اور نیا مواد سامنے آتا ہے تو اقبال کی شخصیت اور فکر نئے امکانات پیدا کرتی ہے اور پرانے خیالات کی جدید تفہیم شروع ہوتی ہے۔

اقبال کی اردو شاعری (بانگِ درا) سے لے کر ان کے بعد کے مجموعہ کلام کی روشنی میں اقبال کی عظمتِ فکر، شاعرانہ مہارت، لفظ و معنی کے طلسم اور تہذیبی و سیاسی شعور کی بھرپور عکاسی کرتی ہے، وہ فکر و عمل کی دنیا میں متاثر ہوتے بھی ہیں اور متاثر کرتے بھی ہیں۔ وہ بیسویں صدی کی ہندوستان کی تہذیبی، لسانی، فکری اور سیاسی زندگی سے متاثر تھے تو یہ عین تقاضائے بشری تھا۔ انسان کی فکر خلا میں پرورش نہیں پاتی بلکہ اس کا رشتہ ہمیشہ اپنی زندگی اور اپنے ماحول سے پیوست رہتا ہے۔ وہ اگر ایک طرف بلند پایہ شاعر اور فلسفی تھے تو ان کے سینے میں انسان کا دل بھی دھڑکتا تھا، وہ فرد کی محبت سے بھی فرحت و انبساط میں ڈوبے ہیں اور ملت کے درد کو بھی شدت سے محسوس کرتے ہیں اور بنی نوع انسان کے احترام میں بھی نغمہ ریز ہیں۔ فرد، قوم، ملک اور عالم انسانیت سبھی ایک بڑے کل کے اجزا ہیں لہٰذا اقبال کی شاعری کو اسی سیاق میں دیکھنا ضروری ہے۔ انسان کی فکر ہمیشہ تغیر پذیر ہوتی ہے۔ ایک نظریہ کے بعد دوسرا نظریہ منصۂ شہود پر آتا ہے اور فکر و خیال کی رعنائیوں سے گزرتا ہے، اس کا دل درد آشنا ہوتا ہے، جہاں کہیں سماج میں ظلم و ستم ایجاد ہوتا ہے وہ اسے برداشت نہیں کرتا۔ اس کے ہاں اس کے لئے ردِ عمل ہونا ناگزیر ہے، اقبال بھی اس طرح کی منزلوں سے گزرے اور اس کا اثر ان کی شاعری میں بھی رونما ہوتا رہا۔

اقبال کی شاعری اور فکر مذکورہ عمل اور ردِ عمل کی ایک کہکشاں ہے، ان کے جذبۂ اندروں کو سمجھنے کی ضرورت ہے، صرف نپے تلے فارمولوں سے اقبال کی شخصیت اور شاعری کو سمجھا نہیں جاسکتا۔ ان کا ذہن اس عہد کا زرخیز ترین ذہن تھا، سرسبزی و شاداب اور فلسفیانہ عظمت سے ان کی ذہنی زندگی عبارت ہے۔ وہ مخصوص سیاق میں ملت کا درد بھی رکھتے تھے،

وطن کی محبت میں بھی اسیر تھے، محبت، عملِ پیہم اور یقینِ محکم پر بھی ایمان رکھتے تھے اور یہ تعلیم دیتے تھے کہ ''

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
قدرت کا اشارہ ہے کہ تو ہر شب کو سحر کر

اقبالؔ کی سوانح پر مختلف ماہرین نے اظہارِ خیال کیا ہے اور ان کی حیات اور افکار کو مختلف زاویہ ہائے نظر سے دیکھا ہے۔ لیکن چند باتیں اور زندگی اور فکر کے کئی پہلو اب بھی پوشیدہ ہیں، چند پر خیال آرائیاں بھی ہوئی ہیں، مگر چند سوالات ایسے بھی ہیں کہ ان خیال آرائیوں اور قیاسات کے تعلق سے شاعر نے خود ہی وضاحتیں پیش کی ہیں اور یہ وضاحتیں پرانے اخبارات میں چھپی ہوئی ہیں اور اقبالؔ سے متعلق کئی سوالات کے جوابات ان اخبارات میں پوشیدہ ہیں۔ لاہور کا انقلاب (مدیر مولانا غلام رسول مہرؔ) اور بمبئی کا روزنامہ خلافت (مدیر مولانا شوکت علی) اس ضمن میں دو اخبارات بہت اہم ہیں جن میں ۱۹۳۰ء کے بعد کے اور خصوصاً گول میز کانفرنس کے حالات اور رپورٹیں شائع ہوئی ہیں۔ بمبئی اقبال کی زندگی کا ایک اہم محور رہا ہے، صرف عطیہ بیگم فیضی ہی نہیں بلکہ لندن کی ایک جھلک بھی انھوں نے بمبئی میں دیکھی اور کہا تھا کہ اگر بابِ لندن کا یہ حال ہے تو لندن کیا ہوگا؟

اس کتاب کے مضامین تنقید و تبصرہ سے زیادہ دستاویزی ہیں اور ان سے حیات و فکرِ اقبال کے کئی نامعلوم گوشے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ روزنامہ اخبارِ خلافت کے فائلوں کی ممبئی میں تلاش کی مگر مایوس رہا۔ میرے حیدرآباد کے اسفار میں جب اردو ریسرچ سینٹر کے مشہور و مقبول علم دوست عبدالصمد صاحب سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ اس اخبار کے تقریباً دس سال کے شمارے ان کے سینٹر میں موجود ہیں۔ میں نے اس سینٹر سے استفادہ کیا جس کی روشنی میں جو مضامین/معلومات روزنامہ اخبار خلافت سے حاصل ہوئیں، اردو کے ایک عظیم تہذیبی حصہ کی حیثیت سے اردو کے علمی حلقے اور خصوصاً اقبال شناسوں کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

چند مضامین کتاب کے عنوان سے غیر متعلق ہیں، میں نے ان مضامین کو دوسرے حصہ

کے تحت شامل کر کے انہیں محفوظ کیا ہے۔ اسی طرح اقبال اور ممبئی کے حوالے سے غازی محی الدین اجمیری کے دو نایاب مضامین ضمیمے کے تحت میں نے اس کتاب میں شامل کئے ہیں۔

میں انجمن اسلام کے علم دوست اور اردو نواز صدر ڈاکٹر ظہیر قاضی صاحب کا صمیمِ قلب سے شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کو انجمنِ اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے اشاعتی پروگرام میں شامل کیا۔

میں برادر محترم عبدالصمد صاحب کا ان کی علمی وادبی اعانت کے لئے بے انتہا شکر گزار ہوں۔ میں اپنے دوست اور ممتاز محقق پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی (سابق چیئرمین، اسکول آف لینگویجز، جواہر لال نہرو یونیورسٹی اور سکریٹری غالب انسٹی ٹیوٹ، دلی) کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے ''اقبال اور بمبئی'' پر ہمت افزا کلمات سے نوازا۔ میں اپنی رفیقِ ادارہ ڈاکٹر سعیدہ پٹیل اور اپنی بیٹی ڈاکٹر معزہ (اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی) کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے تصحیحِ کتاب اور دیگر امور میں میری مدد فرمائی۔ میں اپنی بھابھی محترمہ شمیم محمد قاسم (ایم کیو) دلوی اور اپنے دوست عثمان مالونکر کا ممنون وشکر گزار ہوں جن کے عملی تعاون، اردو دوستی کی وجہ سے اس کتاب کی اشاعت ممکن ہو سکی۔

امید ہے کہ یہ کتاب اقبال شناسوں اور عام قارئین میں پسند کی جائے گی۔

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی — **عبدالستار دلوی**

۱۰/اپریل ۲۰۱۲ء

اقبال اور بمبئی

شہر بمبئی کو ہندوستان کے دیگر شہروں کے مقابلہ میں گذشتہ تقریباً دوسو سال سے ایک امتیازی حیثیت حاصل رہی ہے۔ ابتداً اس کی اس اہمیت کی وجہ اس کا جغرافیائی محل وقوع تھا جسے بعد میں اس کی صنعتی اور تجارتی حیثیت نے اور جلا دی۔ اسے ہندوستان کا دروازہ بھی کہا گیا کہ اسی کے راستہ سے ہندوستان نے اپنے قدرتی تعلقات کو بیرونی ممالک کے ساتھ وسعت دی۔ امپریل گزیٹر کی صراحت کے مطابق "اپنے قدرتی حسن اور مناظر اور تجارتی فوائد اور اہمیت کی وجہ سے مشرق کا کوئی بھی شہر اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔" انیسویں صدی کی ابتداء ہی سے اسے تعلیمی اور تہذیبی حیثیت بھی حاصل ہوگئی۔ ہندوستان میں انگریزی تعلیم کا سورج بھی یہیں طلوع ہوا اور اسی کی شعاعوں کی ضیاباریوں سے ہندوستان کا قریہ قریہ جگمگا اٹھا، انگریزی تعلیم کے ساتھ ایک نئے ذہن کی پرورش و پرداخت شروع ہوئی اور ایک نیا ہندوستانی ذہن بنا جس نے نئے علوم کی مدد سے اپنے اندر خوداعتمادی پیدا کی اور اپنے آپ کو جہاں بانی کے لئے تیار کرلیا۔

بمبئی کی علمی اور تہذیبی حیثیت سے اردو کے دانشور، ادیب اور شاعر ابتدا ہی سے متاثر رہے ہیں، چنانچہ مولانا محمد حسین آزاد فارسی زبان کے علمی مطالعہ کے لئے ژند اور اوستا دپہلوی کے علمی خزانوں کی تلاش میں یہیں پارسیوں کے مذہبی پیشواؤں سے ملے اور ''سخندانِ فارس'' کی بلند علمی عمارت تعمیر کی۔ شیفتہ بھی یہاں کی تہذیبی زندگی اور رہن سہن سے متاثر ہوئے شیفتہ ۱۸۳۸ء میں حجاز جاتے ہوئے بمبئی تشریف لائے تھے۔ اپنے سفر بمبئی کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''۱۳ / ربیع الثانی ۱۲۵۴ھ (مطابق ۷ / مئی ۱۸۳۸ء) کو گھر بندر (گھوڑ بندر) قیام کیا اور ۱۴ / ربیع الثانی کی دوپہر کے وقت مہائم (ماہم) پہنچے۔ بمبئی مہائم سے تین کوس ہے۔ مہائم کو، باب بمبئی کہتے ہیں۔ فقیہہ علی مصنف تفسیر رحمانی کا مزار یہاں پر ہے۔ یہ بزرگ مولانا عبدالرحمن جامیؔ کے ہم عصر تھے۔

''میں تمام سامان مہائم چھوڑ کر بمبئی چلا گیا اور ایک دن ایک رات کے بعد ۱۵ / ربیع الثانی کو شام کے وقت واپس آیا۔ چونکہ قلعہ و شہر کے مکانات کا صحن عنقا ہے اور میں وسعت صحن کا خوگر ہوں اس لیے کھیت باڑی میں جو کہ بیرون شہر اور متصل شہر بھی ایک دلکشا باغ اور مصفاً و منقش مکان منتخب کر لیا گیا۔ تین روز ترتیب مکان کے انتظار میں مہائم میں ٹھہرنا ہوا۔ مہائم سے بمبئی تک اگر چہ دوکان اور بازار فروخندہ و خریدار نہیں، لیکن محلات دل پذیر اور باغات خوش انداز وخوشنما جلوہ گر ہیں۔

''شہر بمبئی کے کیا کہنے۔ اس کے بازار کشادہ ہیں، ہر جنس کی فراوانی ہے، ہر اقسام کی اشیاء بکثرت دستیاب ہیں۔ اگر بمبئی کی تمام خصوصیات کا ذکر مفصل ہو تو کہنے والا بدحواس ہو جائے اور سننے والا تھک جائے۔ بہتر ہے کہ اس کا جامع و مانع وصف بیان کیا جائے اور یہ کہ سوائے اس کے کہ یہاں کی آب و ہوا اچھی نہیں ہے۔ باقی ہر خوبی موجود ہے:

جزایں در تواں گفت در جمال تو عیب
کہ حال مہر و وفا نیست روئی زیبا را

سرسید ۸/ اپریل تا ۱۰/ اپریل ۱۸۶۹ء میں بمبئی میں مقیم رہے۔ بمبئی میں اس زمانہ میں بائکلہ اسٹیشن کو وہی اہمیت حاصل تھی جو اب بوری بندر کو حاصل ہے۔ بائکلہ سے قریب کے علاقہ میں پالن جی کے ہوٹل میں سرسید اپنے دونوں صاحبزادوں سید حامد اور سید محمود کے ساتھ ٹھہرے۔ وہ پالن جی ہوٹل [1] کی آراستگی اور اس کے انتظامات اور سہولتوں سے بہت متاثر ہوئے اور یہاں کی ترقی یافتہ زندگی اور سامانِ آسائش دیکھ کر دم بخود رہ گئے۔ انھوں نے بھنڈی بازار کے علاقہ میں ایک کتب فروش کی دوکان پر [2] ایک صاحب مرزا اشرف علی سے بھی ملاقات کی اور اسی سے قریب ''نواب کی مسجد'' میں شافعی مصلّے پر مغرب کی نماز بھی ادا کی۔ یہاں کے سمندر کی سیر کی، یہاں کے گلی کوچے اور بازار دیکھے اور جامع مسجد کے فنِ تعمیر پر سر دھنتے رہے۔ سرسید نے میمن اور پارسی برادریوں کا بطور خاص ذکر کیا ہے جو اپنے تمول کی وجہ سے شہرت رکھتے تھے۔ یہاں کے رہن سہن، تجارتی عظمت و بڑائی اور طرح طرح کی سواریاں مثلاً پالکی گاڑی (وکٹوریا گاڑی) اور منی بس گاڑیوں کا بہت حیرت اور استعجاب کے ساتھ تذکرہ کیا ہے۔ پارسیوں کی تعریف کرتے ہوئے انھوں نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ وہ اپنی لڑکیوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرتے ہیں۔ انھوں نے البتہ پارسی لڑکیوں کے انگریزی تعلیم حاصل کرنے کو پسند نہیں کیا۔ سرسید کا خیال تھا کہ اپنی زبان کی تعلیم چھوڑ کر انگریزی کی تعلیم ضروری نہیں بقول سرسید ''بمبئی نہایت عمدہ اور نفیس شہر ہے، نہایت بڑی تجارت گاہ ہے، کوئی بات بھی اس شہر میں ہندوستانی شہر کی نہیں ہے، بالکل ایک انگریزی شہر معلوم ہوتا ہے۔ تصویروں میں جو انگریزی شہروں اور بازاروں کے نقشے دیکھے ہیں ہو بہو اسی وضع اور اسی قطع کا شہر ہے۔'' [3]

سرسید جب ۱۸۶۹ء میں عازم لندن ہوئے تو دو روز وہ بمبئی میں مقیم رہے۔ وہ اس شہر سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے اپنے سفرنامہ میں کئی صفحات بمبئی کی تعریف اور اس کی

---

[1] ۔ یہ کلیئر روڈ موجودہ غالب روڈ پر واقع تھا۔

[2] ۔ غالباً سلطان بک ڈپو

[3] ۔ سرسید احمد خاں: مسافرانِ لندن

علمی اور مجلسی زندگی کے بارے میں تحریر کیے ہیں۔ ۱۹۱۰ء تک اردو کے جن ادیبوں اور شاعروں نے بمبئی کے ذوق علمی کی داد دی اور جنھوں نے یہاں کی تہذیبی زندگی کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا ان میں ڈپٹی نذیر احمد، شبلی اور اقبال کے نام بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ شبلی اور اقبال کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ عروس البلاد سے ذہنی، علمی اور جذباتی بھی تھا۔ شبلی اور اقبال کی شاعری کے ابتدائی عوامل بمبئی کی علم پروری اور دوست نوازی کے مرہونِ منت بھی ہیں۔ شبلی اور عطیہ بیگم کے دوستانہ مراسم نے ایک جذباتی حیثیت بھی اختیار کی تھی جسے ان کی حیاتِ معاشقہ سے بھی تعبیر کیا گیا۔ عطیہ بیگم کی وجہ سے جن کا تعلق بمبئی اور نواح بمبئی (جنجیرہ) سے تھا اقبال کا بھی بمبئی سے جذباتی رشتہ پیدا ہو گیا تھا، اگرچہ اس رشتہ کی بنا لندن اور کیمبرج کی علم پرور فضاؤں میں پڑی۔

اقبال اردو کے ممتاز عالمی شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنی تعلیمی زندگی لاہور میں مکمل کرنے کے باوجود علمی تشنگی محسوس کی اور یورپ کی دانشگاہوں میں نئے ساقی اور نئے پیمانوں کی تلاش میں یورپ کا ارادہ کیا تو سرسید کی طرح انہیں بھی بمبئی میں چند دنوں کے قیام کا موقع ملا۔ اقبال ۴؍ ستمبر ۱۹۰۵ء کو بمبئی تشریف لائے۔ انھوں نے اپنے قیامِ بمبئی کے حالات اور واقعات کو اپنے ایک خط میں بیان کیا ہے جو انھوں نے مولوی انشاء اللہ خاں [۱] کے نام تحریر کیا ہے۔ [۲]

---

[۱] ۱۔ مولوی انشاء اللہ خاں اقبال کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ وہ امرتسر کے وکیل نامی اخبار کے ایڈیٹر تھے، بعد میں انھوں نے لاہور سے ہفت روزہ ''وطن'' نکالا۔ بقول فقیر وحید الدین: اخبار ''وطن'' کے ایڈیٹر مولوی انشاء اللہ خاں ڈاکٹر صاحب کے یہاں اکثر آیا جایا کرتے تھے۔ ان دنوں ڈاکٹر صاحب انارکلی میں رہتے تھے۔ انارکلی میں کشمیری طوائفیں بھی رہتی تھیں۔ میونسپلٹی نے ان کے لئے دوسری جگہ تجویز کی۔ چنانچہ انہیں وہاں سے اٹھا دیا گیا۔ اس زمانہ میں مولوی انشاء اللہ خاں کئی مرتبہ ڈاکٹر صاحب سے ملنے گئے، لیکن ہر مرتبہ یہی معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب باہر گئے ہوئے ہیں۔ اتفاق سے جو ایک دن گئے تو ڈاکٹر صاحب گھر پر موجود تھے۔ مولوی صاحب نے کہا، ڈاکٹر صاحب طوائفیں انارکلی سے اٹھوا دی گئی ہیں، آپ کا دل بھی یہاں نہیں لگتا۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا ''مولوی صاحب آخر وہ بھی تو ''وطن کی بہنیں ہیں'' (بحوالہ روزگار فقیر، جلد اول از فقیر وحید الدین)

[۲] ۔ یہ خط خطوط اقبال از رفیع الدین ہاشمی میں شامل ہے۔ یہ خط بقول رفیع الدین ہاشمی ...... شاید لوگوں کی دلچسپی کی خاطر اخبار میں شائع کرنے کی غرض سے لکھے گئے تھے، اور ہفت روزہ ''وطن'' میں شائع ہوئے۔ (ملاحظہ ہو خطوط اقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی ص ۶۷)

''۳ر ستمبر کی صبح کو میر نیرنگ اور شیخ محمد اکرام اور باقی دوستوں سے دہلی میں رخصت ہو کر بمبئی کو روانہ ہوا اور ۴ر کو خدا خدا کر کے اپنے سفر کی پہلی منزل میں پہنچا۔ ریلوے اسٹیشن پر تمام ہوٹلوں کے ٹکٹ ملتے ہیں۔ مگر میں نے ٹامس کک کی ہدایت سے انگلش ہوٹل میں قیام کیا اور تجربہ سے معلوم کیا کہ یہ ہوٹل ہندوستانی طلباء کے لئے جو ولایت جا رہے ہوں نہایت موزوں ہے۔ ریلوے اسٹیشن یہاں سے قریب ہے، گھاٹ یہاں سے قریب ہیں۔ ٹامس کک کا دفتر یہاں سے قریب، غرض ہر قسم کا آرام ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شہر کے باقی تمام ہوٹلوں کی نسبت ارزاں ہے۔ صرف تین روپیہ یومیہ اور ہر قسم کا آرام حاصل کرلو۔ یہاں کا منتظم ایک پارسی پیرمرد ہے۔ جس کی شکل سے اس قدر تقدس ظاہر ہوتا ہے کہ دیکھنے والے کو ایران کے پرانے خشور (نبی) یاد آ جاتے ہیں۔ دکانداری نے اس کو ایسا عجز سکھا دیا ہے کہ ہمارے بعض علماء میں باوجود عبادت اور مرشد کامل کی صحبت میں بیٹھنے کے بھی ویسا انکسار پیدا نہیں ہوتا۔ کارلائل نے کیا خوب کہا ہے کہ:

محنت ہی بہت بڑی عبادت ہے

''میرے دل پر اس پیرمرد کی صورت کچھ ایسا اثر کرتی تھی کہ بعض اوقات اسے دیکھ کر میری آنکھیں پُرنم ہو جاتی تھیں۔ لیکن جب اس کی وقعت میرے دل میں اندازہ سے زیادہ ہوگئی تو ایک عجیب واقعہ پیش آیا جس کا بیان بعض وجوہ سے ضروری ہے۔ میں ایک شام نیچے کی منزل میں کرسی پر بیٹھا تھا کہ پارسی پیرمرد کمرے سے باہر نکلا۔ اس کی بغل میں شراب کی ایک بوتل تھی۔ جب اس نے مجھے بیٹھے ہوئے دیکھا تو اس کو چھپانے کی کوشش کی اور میں نے دور سے تاڑ کر آواز دی کہ سیٹھ صاحب ہم سے کیوں چھپاتے ہو، خوشی سے اس کا شوق کرو۔ ذرا مسکرایا اور کچھ پئے ہوئے بھی تھا بولا:

سرابِ شوک پینے سے سبھی گم دور ہو جائے

''میں نے اس کو کہا واہ رے بڈھے خدا تیری عمر دراز کرے اور تیری پرانی شاخ سے بہت سا میوۂ نورس پیدا ہو کر بمبئی کھیت باڑی میں بکتا پھرے۔

''اس ہوٹل میں ایک یونانی بھی آ کر مقیم ہوا۔ جو ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولتا تھا۔ میں نے

ایک روز اس سے پوچھا تم کہاں سے آئے ہو؟ بولا چین سے آیا ہوں، اب ٹرانسوال جاؤں گا۔ میں نے پوچھا چین میں تم کیا کام کرتے تھے؟ کہنے لگا سوداگری کرتا تھا لیکن چینی لوگ ہماری چیزیں نہیں خریدتے۔ میں نے دل میں کہا ہم ہندیوں سے تو یہ افیمی ہی عقلمند نکلے کہ اپنے ملک کی صنعت کا خیال رکھتے ہیں۔ شاباش افیمیو، شاباش! نیند سے بیدار ہو جاؤ۔ ابھی تم آنکھیں ہی مل رہے ہو کہ اس سے دیگر قوموں کو اپنی اپنی فکر پڑ گئی ہے۔ ہاں ہم ہندوستانیوں سے یہ توقع نہ رکھنا کہ ایشیا کی تجارتی عظمت کو ازسرنو قائم کرنے میں تمہاری مدد کر سکیں گے۔ ہم متفق ہو کر کام کرنا نہیں جانتے۔ ہمارے ملک میں محبت اور مروت کی بو باقی نہیں رہی۔ ہم اس کو پکا مسلمان سمجھتے ہیں جو ہندوؤں کے خون کا پیاسا ہو اور اس کا پکا ہندو خیال کرتے ہیں جو مسلمان کی جان کا دشمن ہو۔[1] ہم کتاب کے کیڑے ہیں اور مغربی دماغوں کے خیالات ہماری خوراک ہیں۔ کاش خلیج بنگالہ کی موجیں ہمیں غرق کر ڈالیں! مولوی صاحب، میں بے اختیار ہوں۔ لکھنے تھے سفر کے حالات اور بیٹھ گیا ہوں وعظ کرنے۔ کیا کروں! اس سوال کے متعلق تاثرات کا ہجوم میرے دل میں اس قدر ہے کہ بسا اوقات مجھے مجنوں سا کر دیا اور کر رہا ہے۔"

اقبال آگے چل کر لکھتے ہیں:

"ایک شب کھانے کے کمرے میں تھا کہ دو جنٹلمین میرے سامنے آ بیٹھے۔ شکل سے معلوم ہوتا تھا کہ یورپین ہیں، فرانسیسی میں باتیں کرتے تھے۔ آخر جب کھانا کھا کر اٹھے تو ایک نے کرسی کے نیچے سے اپنی ترکی ٹوپی نکال کر پہنی۔ جس سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ یہ کوئی ترک ہے۔ میری طبیعت بہت خوش ہوئی۔ اور مجھے یہ فکر پیدا ہوئی کہ کسی طرح ان سے ملاقات ہو۔ دوسرے روز میں نے خواہ مخواہ باتیں شروع کیں۔ یورپ کی اکثر زبانیں سوائے انگریزی کے جانتا تھا میں نے پوچھا فارسی جانتے ہو۔ بولا بہت کم۔ پھر میں نے اس سے فارسی میں گفتگو شروع کی، لیکن وہ نہ سمجھتا تھا آخر بہ مجبوری ٹوٹی پھوٹی عربی میں اس سے باتیں کیں۔ یہ نوجوان ترک، ینگ ترک پارٹی سے تعلق رکھتا ہے اور سلطان عبدالحمید کا سخت مخالف ہے۔

---

[1] ۔ اقبال کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اس افتراق کا بے حد غم تھا، اس کے اشارے ان کے کلام میں بھی پائے جاتے ہیں، اس سے ان کے قوم پرست ذہن کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ وہ شاعر بھی ہے۔ میں نے درخواست کی کہ اپنے شعر سناؤ۔ کہنے لگا، میں کمال بے (ترکی کا سب سے بڑا مشہور زندہ شاعر) کا شاگرد ہوں اور اکثر پولیٹیکل معاملات پر لکھا کرتا ہوں۔ کمال بے کے جو اشعار اس نے سنائے وہ سب کے سب نہایت عمدہ تھے۔ لیکن جو شعر اپنے سنائے وہ سب کے سب سلطان کی ہجو میں تھے۔ ان میں سے ایک شعر یہاں درج کرتا ہوں۔

ظلم و جورن توسفوجہ پر ملتے محو ایلیور　　　آدمیت ملک و ملت دشمن عبدالحمید

"یعنی کبیر ظلم و جور نے تمام قوم کو مٹا دیا ہے۔ عبدالحمید آدمیت اور ملک وقوم سب کا دشمن ہے۔"

"اس مضمون پر اس سے بہت گفتگو ہوئی اور میں نے اسے بتایا کہ ینگ پارٹی کو انگلستان کی تاریخ سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ کیونکہ جس طریق سے رعایا انگلستان نے بتدریج اپنے بادشاہوں سے پولیٹیکل حقوق حاصل کئے ہیں وہ طریق سب سے عمدہ ہے۔ بڑے بڑے عظیم الشان انقلابوں کا بغیر کشت وخون کے ہو جانا یہ کچھ انگلستان ہی کا حصہ ہے۔

ایک روز سرِ شام میں اور یہ ترک جنٹل مین بمبئی کا اسلامیہ مدرسہ [1] دیکھنے چلے گئے۔ وہاں اسکول کی گراؤنڈ میں مسلمان طلبا کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ہم نے ان میں سے ایک کو بلایا اور اسکول کے متعلق بہت سی باتیں اس سے دریافت کیں۔ میں نے اس طالب علم سے پوچھا کہ انجمن اس اسکول کو کالج کیوں نہیں بنا دیتی، کیا فنڈ نہیں ہے۔ اس نے جواب دیا کہ فنڈ تو موجود ہے اور اگر ضرورت ہو تو ایک آن میں موجود ہو سکتا ہے۔ کیونکہ خدا کے فضل سے یہاں بڑے بڑے متمول مسلمان سوداگر موجود ہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ مسلمان طلبا پڑھنے کے لئے نہیں آتے ہیں، اس کے علاوہ اور اچھے اچھے کالج بمبئی میں موجود ہیں۔ [2] اور جیسی تعلیم ان

---

[1]۔ انجمنِ اسلام جس کا ۱۸۷۶ء میں قیام عمل میں آیا۔ محمد علی روگھے اور جسٹس بدرالدین طیب جی اس کے بانیوں میں تھے۔

[2]۔ الفنسٹن کالج بمبئی ہی نہیں بلکہ ہندوستان کا قدیم ترین کالج ہے۔ (۱۸۵۸ء) اپنے تعلیمی معیار کے لئے اس کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ اسی طرح ولسن کالج اور سینٹ زیویرس کالج بھی بمبئی کے قدیم کالجوں میں سے ہیں اور اپنے تعلیمی معیار کے لئے شہرت رکھتے ہیں۔ اسماعیل یوسف کالج جو بنیادی طور سے مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات کے پیش نظر قائم کیا گیا ۱۹۳۰ء کی یادگار ہے۔

میں ہوتی ہے ویسی سردست ہم یہاں دے بھی نہیں سکتے۔ یہ جواب سن کر میں بہت خوش ہوا۔ میرا خیال تھا کہ بمبئی جیسے شہر میں مسلمانوں کا کالج ضرور ہوگا۔ کیونکہ یہاں کے مسلمان تمول میں کسی اور قوم کے پیچھے نہیں ہیں لیکن یہاں آ کر معلوم ہوا کہ تمول کے ساتھ ان میں عقل بھی ہے۔ ہم پنجابیوں کی طرح احمق نہیں ہیں۔ ہر چیز کو تجارتی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور نفع ونقصان پر ہر پہلو سے غور کر لیتے ہیں۔

''غرض کہ بمبئی (خدا اسے آباد رکھے) عجب شہر ہے۔ بازار کشادہ، ہر طرف پختہ سربفلک عمارتیں ہیں کہ دیکھنے والے کی نگاہ ان سے خیرہ ہوتی ہے۔ بازاروں میں گاڑیوں کی آمد و رفت اس قدر ہے کہ پیدل چلنا محال ہو جاتا ہے۔ یہاں ہر چیز مل سکتی ہے۔ یورپ، امریکہ کے کارخانوں کی کوئی چیز طلب کرو فوراً ملے گی۔ ہاں البتہ ایک چیز ایسی ہے جو اس شہر میں نہیں مل سکتی۔ یعنی فراغت۔''

''یہاں پارسیوں کی آبادی اسی نوّے ہزار کے قریب ہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام شہر پارسیوں کا ہے۔ اس قوم کی صلاحیت نہایت قابلِ تعریف ہے اور ان کی دولت و عظمت بے اندازہ، مگر اس قوم کے لئے کسی اچھی فیوچر Future کی پیشن گوئی نہیں کر سکتا۔ یہ لوگ عام طور پر سب کے سب دولت کمانے کی فکر میں ہیں اور کسی چیز پر اقتصادی پہلو کے سوا کسی اور پہلو سے نگاہ ہی نہیں ڈال سکتے۔ [1] علاوہ اس کے نہ کوئی ان کی زبان ہے نہ ان کا لٹریچر ہے۔ اور طرّہ یہ کہ فارسی کو نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ [2] افسوس! یہ

---

[1] ۔ یہ بات پوری طرح صحیح نہیں، انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں بمبئی کی تہذیبی زندگی نے پارسیوں سے بہت کچھ پایا۔ خود اردو زبان و ادب میں ڈراما انھیں کی یادگار ہے۔ تعلیمی وظائف اور رفاہ عامہ کے کاموں میں پارسی ہمیشہ پیش پیش رہے۔ اقتصادی اور معاشی استحکام ہی سے زندگی اور تہذیب کے دیگر شعبوں کی خوبصورت توسیع ممکن ہوتی ہے اور پارسی اس لحاظ سے کسی بھی قوم کے مقابلہ میں پیچھے نہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اپنی تعداد (پارسیوں کی تعداد سوا لاکھ سے زیادہ نہیں ہے) کے لحاظ سے سب سے ممتاز ہیں۔

[2] ۔ اب پارسی فارسی سے بڑی دلچسپی لے رہے ہیں اور اسے اپنا رہے ہیں۔ پارسیوں کی گھریلو زبان گجراتی ہے چونکہ معیاری زبان سے مختلف ہے اس لئے اسے پارسی گجراتی کہا جاتا ہے۔ اسے گجراتی کا ایک Social Dialect کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

لوگ فارسی لٹریچر سے غافل ہیں ورنہ ان کو معلوم ہوتا کہ ایرانی لٹریچر میں عربیت کو فی الحقیقت کوئی دخل نہیں بلکہ زردشتی رنگ اس کے رگ و ریشے میں ہے اور اس پر اس کے حسن کا دارومدار ہے۔ میں نے اسکول کے پارسی لڑکے اور لڑکیوں کو بازار میں پھرتے دیکھا۔ چستی کی مورتیں تھیں۔ مگر تعجب ہے کہ ان کی خوبصورت آنکھیں اسّی فیصدی کے حساب سے عینک پوش تھیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ عینک پوشی پارسیوں کا قومی فیشن ہوتا جاتا ہے۔ معلوم نہیں کہ ان کے قومی ریفارمر اس طرف توجہ کیوں نہیں دیتے۔ اس شہر کی تعلیمی حالت عام طور پر نہایت عمدہ معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے ہوٹل کا حجام ہندوستان کی تاریخ کے بڑے بڑے واقعات جانتا تھا۔ گجراتی کا اخبار ہر روز پڑھتا تھا اور جاپان اور روس کی لڑائی سے پورا باخبر تھا۔ نوروجی دادا بھائی[1] کا نام بڑی عزت سے لیتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا: نوروجی انگلستان میں کیا کرتا ہے؟ بولا: ہجور کالوں کے لئے لڑتا ہے۔ ہوٹل کے نیچے مسلمان دوکاندار ہیں۔ میں نے دیکھا ہر روز گجراتی اخبار پڑھتے تھے۔[2] میں نے ایک روز ان سے پوچھا، تم اردو پڑھ سکتے ہو، کہنے لگے: نہیں، سمجھ سکتے ہیں، پڑھنا نہیں جانتے۔ میں نے پوچھا کہ جب مولوی تمہارے نکاح پڑھاتا ہے تو کون سی زبان بولتا ہے۔ مسکرا کر بولا: اردو! یہاں پر ہر کوئی اردو سمجھ سکتا ہے اور ٹوٹی پھوٹی بول بھی لیتا ہے۔ ہمارے ہوٹل کا سیٹھ (وہی بوتل والا پیر مرد) کبھی ہندوستان[3] نہیں گیا مگر اردو خاصی بولتا تھا۔

''میں بمبئی یعنی بابِ لنڈن کی کیفیت دیکھ کر حیران ہوں، خدا جانے لنڈن کیا ہوگا۔ جس کا دروازہ ایسا عظیم الشان ہے۔''

مذکورہ بالا خط جس کا طویل اقتباس میں نے دیا۔ واحد دستاویزی خط ہے جس سے اقبال کے بمبئی سے متعلق تاثرات کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے اس خط کے ذریعہ ابتدائے

---

[1] ۔دادا بھائی نوروجی ہندوستانی آزادی کے مجاہد جو ہندوستان کے مرد بزرگ کہلاتے تھے۔

[2] ۔بمبئی کے مسلمانوں میں میمن، بورہ اور اسماعیلی (خوجہ) حضرات کی گھریلو زبان گجراتی رہی ہے اور یہی بمبئی کے تاجر پیشہ مسلمان ہیں۔ بوہروں میں صرف طیب جی فیملی نے اردو کو اپنا لیا تھا، طیب جی فیملی کے جد اعلیٰ طیب علی بھائی میاں نے اپنے زمانہ کی اردو میں اپنی خود نوشت سوانح عمری بھی لکھی ہے۔

[3] ۔مراد ہے شمالی ہندوستان اور خاص طور سے یوپی

بیسویں صدی کی بمبئی کی علمی اور تہذیبی زندگی پر روشنی ڈالی ہے یہاں کے رہن سہن کا نقشہ کھینچا ہے، یہاں کی ارزانی کی کیفیت بیان کی ہے۔ یہاں کے مسلمانوں کی تعلیمی حیثیت اور عملی سوجھ بوجھ اور اسی طرح پارسیوں کے طریقۂ زندگی کے مثبت اور منفی پہلوؤں پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ بمبئی کی مخصوص بولی کا بھی ذکر ہے جو رابطہ کی زبان کی حیثیت سے پارسیوں کی بھی زبان رہی ہے اور جسے بمبئی کے مسلمان اپنی علاقائی یا گھریلو زبان کے ساتھ تہذیبی طور پر استعمال کرتے ہیں۔

اقبال نے جس اسلامیہ مدرسہ کا ذکر کیا ہے وہ انجمن اسلام ہائی اسکول ہے جو ۱۸۹۳ء میں بمبئی کے کوکنی، میمن، بوہرہ اور دیگر مسلمانوں کے تعلیمی شعور کی یادگار کے طور پر قائم ہوا اور جس نے نہ صرف شہر بمبئی بلکہ سارے مہاراشٹر کے مسلمانوں میں اردو زبان اور تعلیم کو پھیلانے میں مدد دی۔ ۱۹۰۵ء کے مقابلہ میں اب حالات اس قدر مختلف ہیں کہ اب اردو یہاں کے مسلمانوں کی عام زبان کے طور پر رائج ہے اور تعلیمی شعور زمانہ کی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ اس قدر بیدار ہے کہ نہ صرف انجمنِ اسلام بلکہ دیگر تعلیمی اداروں کے تحت نہ صرف اسکول بلکہ کئی کالج بھی قائم ہو چکے ہیں۔ اقبال نے جس زمانہ کی بمبئی کا اپنے خط میں ذکر کیا ہے اس وقت بمبئی کے متمول مسلمانوں میں مقبہ، روگھے، کھٹکھٹے، طیب جی، تنگیکر، سوبانی وغیرہ کئی خاندان تھے جنھوں نے مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات کو نہ صرف بمبئی کی حد تک محسوس کیا بلکہ احسن مقبہ نے علی گڑھ کے ابھرتے ہوئے تعلیمی سیلاب کو وسعت دینے میں دامے درمے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔

سرسید اور اقبال دونوں یہاں کی عام تہذیبی وثقافتی فضا اور تعلیمی تگ ودو سے متاثر تھے اور دونوں نے پارسیوں کو اپنے مخصوص نظریات کے ساتھ بمبئی کی زندگی میں امتیازی حیثیت دی ہے۔ ان دونوں بزرگوں نے بمبئی کی تعلیمی حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔ دونوں کے پارسیوں کے سلسلے میں خیالات میں مجموعی طور سے ایک ہی سا تاثر ہے، تاہم چونکہ سرسید کے زمانہ میں ابھی انجمن اسلام کا قیام عمل میں نہیں آیا تھا اسلئے وہ مسلمانوں کی تعلیم سے متعلق خاموش ہیں، لیکن اقبال انجمنِ اسلام کی تعلیمی تحریک سے متعارف ہوئے، انھوں نے یہاں کے مسلمانوں کے عملی نقطۂ نظر کی یہ کہہ کر داد دی کہ ''یہاں آکر معلوم ہوا کہ تمول کے ساتھ ان میں

عقل بھی ہے، ہم پنجابیوں کی طرح احمق نہیں ہیں۔" سرسید اور اقبال دونوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو اپنی نثر اور نظم کے ذریعہ بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ مسلمانوں میں آج جو بھی بیداری دکھائی دیتی ہے اس کی بنیادی وجہ سرسید کی نثر اور اقبال کی شاعری ہے۔ ایسے میں اگر ان سے یہاں کے مسلمانوں کو ان کے کام کی داد ملے تو حقیقتاً اس داد کی بڑی قیمت ہے جس پر بمبئی کے مسلمانوں کو یقیناً خوش ہونا چاہئے۔

بمبئی کے بازاروں کی کشادگی، مختلف اشیاء کی فراوانی، زندگی کی ہماہمی اور مصروفیات، اس کی نفاست اور تجارتی اہمیت، گاڑیوں کی آمد ورفت اور پختہ سربفلک عمارتیں اور ان کے دیگر محاسن کا شیفتہ، سرسید اور اقبال تینوں نے اعتراف کیا ہے۔ عروس البلاد کی عظمت و بڑائی اور ہندوستانی شہروں میں اس کے امتیازی مقام کا سرسید اور اقبال دونوں کو اعتراف تھا۔ اگر ایک طرف سرسید کو یہ اعتراف تھا کہ "کوئی بات بھی اس شہر میں ہندوستانی شہر کی نہیں ہے، بالکل انگریزی شہر معلوم ہوتا ہے۔" وہیں اقبال کو بھی اس بات کا احساس ہے کہ "جب بابِ لندن اس قدر حیران کن ہو تو لندن کی عظمت و بڑائی کیا ہوگی؟"

بمبئی کی سیر سے سرسید اور اقبال دونوں کو یورپ کی ترقی اور عظمت و بڑائی کا اندازہ ہوا۔ اس شہر کو دیکھنے سے ان کے تصور نے یورپی شہروں کی رفتار ترقی کا اندازہ کرلیا۔ اور ذہنی اعتبار سے اس میں زندگی گزارنے کے لئے اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کی ہوگی۔ تعلیمی اعتبار سے اور عام ہندوستان میں تعلیمی، سیاسی، اصلاحی و معاشی تحریکوں اور ترقیوں کا نقطۂ آغاز بمبئی ہے اور یہ حقیقت ہمارے مصلحین اور دانشوروں سے پوشیدہ نہیں اس سلسلہ میں اقبال کے اعترافات حقائق کی داد دینے کے مترادف ہیں۔

اقبال دوسری مرتبہ دسمبر ۱۹۲۸ء میں دلی میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں شرکت کے بعد غالباً چند گھنٹوں بمبئی میں قیام کے بعد جنوبی ہند کے سفر پر روانہ ہوئے۔ اس سفر میں چودھری محمد حسین اور عبداللہ چغتائی بھی اقبال کے ساتھ شریکِ سفر رہے[۱] اور تیسری بار ۱۰ ر ستمبر ۱۹۳۱ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے لندن جاتے ہوئے بمبئی تشریف لائے اور تین روز یہاں قیام فرمایا۔ بمبئی میں اپنے قیام کا ذکر خود اقبال نے منشی طاہر الدین کے

[۱] ۔ نقوش (اقبال نمبر) شمارہ ۱۲۱ ستمبر ۱۹۷۷ء ص ۱۷

نام اپنے ایک خط میں کیا ہے۔ بقول اقبال:

"بمبئی پہنچتے ہی سردار صلاح الدین سلجوقی، قونصل افغانستان مقیم بمبئی نے دعوت دی۔ ان کے ہاں پرلطف صحبت رہی۔ سردار موصوف فارسی اور عربی ادبیات پر پورا عبور رکھتے ہیں۔ عربی کی جدید شاعری سے بھی باخبر ہیں۔ فارسی میں خاقانی کے بڑے معترف ہیں۔ علوم دینی میں بھی کافی دسترس رکھتے ہیں، ہرات کے قاضی رہ چکے ہیں۔ انکے دولت کدہ پر مرزا طلعت یزدی نے جو بمبئی میں دس سال سے مقیم ہیں، ایرانی لہجے میں اشعار سنائے۔۔۔۔ اسی شام عطیہ بیگم صاحبہ کے ہاں سماع کی صحبت رہی، جہاں اہلِ ہوس بار نہ پا سکے، ۱۲ ستمبر کو ایک بجے کے قریب بمبئی سے روانہ ہوئے۔[۱]"

دوسری گول میز کانفرنس کے لئے بمئی سے روانگی سے قبل اقبال نے بمبئی کرانیکل کے خصوصی نمائندہ کو ایک انٹرویو بھی دیا جس میں انھوں نے غیر مسلم، پین اسلامزم، امپریلزم، بالشوزم، قومیت کے نظریہ، عرب ممالک کے وفاق وغیرہ مختلف موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔[۲]

اقبال نے عطیہ بیگم کے ہاں جس محفلِ سماع کا ذکر کیا ہے، اس محفل میں جناب ضیاء الدین احمد برنی بھی موجود تھے۔ انھوں نے اس محفل کے سجانے میں عطیہ بیگم کا ہاتھ بھی بتایا اور اس بزم کے واقعات کو چشم دید گواہ کی حیثیت سے محفوظ بھی کیا ہے۔ جناب برنی ڈاکٹر اقبال سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"ڈاکٹر اقبال سے میری آخری ملاقات بمبئی میں ستمبر ۱۹۳۱ء میں ہوئی جبکہ وہ دوسری گول میز کانفرنس سے واپس ہوئے تھے۔[۳] اور خلافت ہاؤس میں مقیم تھے۔ انہیں دونوں

---

[۱] ۔ سفرنامہ اقبال مرتبہ حق نواز، ص ۹۲-۹۱

[۲] ۔ سفرنامہ اقبال مرتبہ حق نواز، ص ۸۶

[۳] ۱۔ ایوانِ رفعت کی یہ ملاقات گول میز کانفرنس میں جانے سے پہلے ۱۰ ستمبر کو ہوئی تھی، جس کی یادگار ۱۰ ستمبر ۱۹۳۱ء کو علامہ کا لکھا ہوا وہ پرائیویٹ شعر بھی ہے۔ برنی صاحب نے شاید سہواً یہ لکھا ہے کہ یہ ملاقات گول میز کانفرنس سے واپسی پر ہوئی۔

ایک سہ پہر کو محترمہ عطیہ بیگم نے اپنے دولت کدہ ''ایوانِ رفعت'' میں انہیں چائے پر مدعو کیا۔ اس موقع پر ہائی کورٹ کے جج مرزا علی اکبر خاں، مولانا محمد عرفان [1]، ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی اور بہت سے اکابر و فضلاء موجود تھے۔''بقول ضیاء الدین احمد برنی ''یہ ٹی۔ پارٹی لان میں دی گئی تھی جس میں پھولوں کی پُر بہار روشوں اور سمندری ماحول کی وجہ سے ایک خاص دل آویزی پیدا ہوگئی تھی۔''

برنی لکھتے ہیں کہ اس وقت وہ عطیہ بیگم کی مدد کرنے کے خیال سے ''ایوانِ رفعت'' بہت پہلے پہنچ گئے تھے، اتفاق یہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کو پہنچنے میں دیر ہوگئی۔ بیگم صاحبہ بہت گھبرائی ہوئی تھیں، اور اسی حالت میں مجھ سے فرمایا کہ ''موٹر لے کر جاؤ اور ڈاکٹر صاحب کو لاؤ۔ ابھی چند فرلانگ گیا ہوں گا کہ دیکھا ڈاکٹر صاحب اور مولانا عرفان چلے آرہے ہیں۔ میں ان کی گاڑی میں بیٹھ گیا اور عرض کیا کہ' آپ کا وہاں بڑی شدت سے انتظار کیا جارہا ہے۔' ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ' میں آج عطیہ بیگم کو ذرا ستانا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ' یہ کام تو آپ پھر بھی کرسکتے ہیں، لیکن آپ کے انتظار میں جو اکابر جمع ہیں انہیں آپ کس مد میں ستارہے ہیں؟'، بہر حال ڈاکٹر صاحب چلنے پر رضامند ہوگئے۔ تھوڑی دیر میں ہم ''ایوانِ رفعت'' پہنچ گئے جہاں دروازہ پر بیگم صاحبہ اور فیضی رحمین [2] نے ان کا استقبال کیا۔ بیگم صاحب کے شکوہ و شکایت کے بعد ہم سب لان میں پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب کو جتنا مسرور میں نے اس سہ پہر کو دیکھا اتنا کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ عطیہ بیگم سے ہنس ہنس کر مختلف موضوعات پر گفتگو کررہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ مزاقیہ جملے بھی کستے جاتے تھے۔ مجھے ایک جملہ یاد رہ گیا۔ دورانِ گفتگو عطیہ بیگم نے کہا: ''اقبال یاد رکھو، بچہ کے لئے ماں کی گود سب سے بڑی تربیت گاہ ہے۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے ہنس کر پوچھا: اور بیوی کی گود کے بارے میں کیا ارشاد ہوتا

---

[1] ۔مولانا محمد عرفان سرحد کے رہنے والے تھے، ایک عرصہ تک دہلی میں قیام کرنے کے بعد بمبئی تشریف لائے اور یہیں کے ہورہے۔ پشتو کے علاوہ اردو، عربی، فارسی پر زبردست عبور حاصل تھا۔ مولانا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے بھی رکن تھے، ۱۴/اپریل ۱۹۳۹ء میں انتقال ہوا۔ دیکھیے عظمت رفتہ از ضیاء الدین احمد برنی ص ۸۱۔۷۷ ۳

[2] ۔عطیہ بیگم کے نومسلم شوہر، مشہور مصوّر

ہے؟، عطیہ بیگم نے جھڑک کر انہیں خاموش کر دیا۔"

ضیاء الدین احمد برنی اسی بزمِ بے تکلف کے بارے میں لکھتے ہیں:

"چائے نوشی سے فارغ ہوتے ہی بیگم صاحبہ نے معزز مہمان کا تعارف کرایا اور ان سے درخواست کی کہ وہ کچھ پیغام دیں۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کھڑے ہوئے اور مختصر سی تقریر کی اور ساتھ ہی اپنا ایک شعر سنایا اور فرمایا کہ، یہی میرا پیغام ہے۔ وہ شعر یہ ہے:

چناں بزی کہ اگر مرگ تست مرگ دوام

خدا ز کردۂ خود شرمسار می گردد

Live So Beautifully
That if death is the end of all
God himself may be put to shame
For having ended thy career

"ایوانِ رفعت" کی اس محفل سے متعلق برنی صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں:

"لان سے سب حاضرین کو ہال میں لے جایا گیا جہاں رقص و سرور کا انتظام تھا۔ میں ڈاکٹر صاحب کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر تک موسیقی ہوتی رہی اور اس کے بعد رقص ہوا۔ ایک کالی کلوٹی عیسائی لڑکی نے اپنے کمالات دکھائے۔ رقص کے دوران میں ڈاکٹر صاحب نے ایک کاغذ طلب کیا اور ذیل کے اشعار لکھ کر انہیں عطیہ بیگم کی خدمت میں پیش کیا:

ترسم کہ تو می رانی زورق بہ سراب اندر

زادی بہ حجاب اندر میری بہ حجاب اندر

برکشت و بیاباں پیچ بر کوہ و بیاباں

برقے کہ بہ خود پیچد میرد بہ سحاب اندر

ایں صوت دل آویزے از زخمۂ مطرب نیست

مہجور جناں حورے نالد بہ رباب اندر

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر صاحب نے ذیل کا مزاحیہ شعر ایک کاغذ پر لکھ کر عطیہ بیگم کو دیا:

پرائیویٹ

عالمِ جوشِ جنوں میں ہے روا کیا کیا کچھ
کہیے کیا حکم ہے دیوانہ بنوں یا نہ بنوں
محمد اقبال، بمبئی، ۱۰؍ ستمبر ۱۹۳۱ء

تقریب کے بعد ڈاکٹر صاحب نے معزز مہمانوں سے ہاتھ ملائے اور ''ایوانِ رفعت'' سے رخصت ہو گئے۔''[۱]

چوتھی بار ۱۹۳۱ء میں ہی جب اقبال لندن سے ہندوستان لوٹے تو ۲۸؍ دسمبر کے دن صرف ایک روز کے لئے انھوں نے بمبئی میں قیام فرمایا۔ اس مرتبہ انھوں نے ''خلافت ہاؤس'' میں آرام کیا اور شام کو ''ایوانِ رفعت'' میں عطیہ فیضی سے نصف گھنٹے ملاقات کی۔[۲]

آخری مرتبہ اقبال ۱۹۳۲ء میں تیسری گول میز کانفرنس میں جاتے ہوئے بمبئی تشریف لائے۔ اس وقت ان کا قیام اپنے دیرینہ دوست صلاح الدین سلجوقی کے ہاں تھا جو ہندوستان میں افغانستان کے سفیر تھے اور جنھوں نے اقبال کی وفات کے بعد حکومتِ افغانستان سے تعویذ اور لوحِ مزار حاصل کیا جو دنیا کے سب سے قیمتی پتھر (Lapis Lazuli) پر ہے۔[۳]

تیسری گول میز کانفرنس سے اقبال یورپ کی سیاحت کو گئے اور اسپین کا بھی سفر کیا۔ اس سفر سے واپسی پر اقبال فروری ۱۹۳۳ء میں پھر بمبئی آئے۔ اس مرتبہ جو غالباً علامہ اقبال کا آخری سفرِ بمبئی تھا، انھوں نے اس زمانہ کی بمبئی کے معروف اردو روزنامہ ''خلافت'' کے نامہ نگار کو بھی ایک انٹرویو دیا۔ اور اسپین سے متعلق اپنے تاثرات بیان کئے ہیں۔[۴]

---

[۱] ۔مندرجہ بالا ''ایوانِ رفعت'' سے متعلق یہ تفصیلات ''عظمت رفتہ'' از ضیاء الدین احمد برنی سے ماخوذ ہیں، دیکھئے ص ۲۷۳ تا ۲۷۶۔ اس محفل سماع کا ذکر ضیاء الدین احمد برنی نے اپنے ایک اور مضمون ''ایک بھولی ہوئی صحبت'' مشمولہ اقبال از عطیہ بیگم میں بھی کیا ہے۔

[۲] ۔نقوش (اقبال) شمارہ ۱۲۱، ستمبر ۱۹۷۷ء، حیات نامۂ اقبال از رفیع الدین ہاشمی ص ۲۰

[۳] ۔روزگار فقیر از سید فقیر وحید الدین جلد اول ص ۲۵۳-۵۵

[۴] ۔اقبال کے یہ تاثرات ''آئینہ اقبال'' مرتبہ محمد عبداللہ قریشی اور سفر نامہ اقبال مرتبہ حق نواز ص ۱۹۷-۱۹۸ میں محفوظ ہیں۔

اس طرح جو معلومات دستیاب ہوئی ہیں اس کے مطابق اقبال کل چھ بار بمبئی تشریف لائے ہیں جن میں سے ۱۹۰۵ء اور ۱۹۳۱ء میں بمبئی میں اقبال کی آمد سے متعلق کچھ تفصیلات ملتی ہیں، اگر اس زمانہ کے اخبارات میسر آئیں تو ممکن ہے بمبئی میں اقبال کے قیام، تعلقات اور جلسوں اور علمی محفلوں سے متعلق زیادہ معلومات فراہم ہوسکیں اور اس طرح اقبال کی سوانح عمری میں کچھ تفصیلات کا اضافہ ہو۔

۲۱/ اپریل ۱۹۳۸ء میں اقبال کی وفات کی خبر جب سارے ملک میں پھیلی تو اقبال کی عظیم شاعرانہ اور فلسفیانہ شخصیت اور ہندوستان گیر مقبولیت کے پیش نظر بمبئی کے آل انڈیا ریڈیو کی دعوت پر جو اس زمانہ میں بیلارڈ اسٹیٹ میں واقع تھا، پروگرام ڈائرکٹر بی۔ سی۔ مرڈھیکر (مشہور مراٹھی شاعر) کی دعوت پر بمبئی کی مشہور علمی شخصیت اور بلند پایہ مورخ ڈاکٹر پی۔ ایم۔ جوشی نے اقبال کو بمبئی کے آل انڈیا ریڈیو سے خراجِ عقیدت پیش کیا۔ بقول ڈاکٹر جوشی [1] نے راقم الحروف کو بتایا کہ چونکہ وہ لندن میں اقبال سرکل کے ممبر رہ چکے تھے انھوں نے آل انڈیا ریڈیو کی دعوت فوراً قبول کی اور اپنی تقریر میں ترانۂ ہندی کے علاوہ اقبال کی جس نظم کو خاص طور سے پیش کیا وہ ''نیا شوالہ'' تھی، جو اقبال کی حب الوطنی کی نادر و یادگار جذبات کی یادگار ہے اور جو آج بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی کہ وہ اقبال کے دور میں اہم تھی۔

[1]۔ ڈاکٹر پی۔ ایم۔ جوشی میرے مربّی اور استاد تھے۔ انھوں نے تاریخِ بیجاپور پر تحقیق کی تھی۔

اقبال کی بمبئی میں آمد اور مسلمانوں کے نام ان کا پیغام

اقبال ۱۹۳۱ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کی غرض سے بمبئی تشریف لائے۔ اس وقت ان کی آمد و سفر کی اطلاع روزنامہ خلافت (بمبئی) میں شائع ہوتی رہی۔ اس وقت اقبال نے بمبئی میں تین روز قیام فرمایا۔ بمبئی آنے سے قبل خلافت ہاؤس کو اطلاع کر دی گئی تھی۔ اس وقت غازی محی الدین اجمیری خلافت ہاؤس کے سکریٹری تھے۔ اقبال کی آمد پر مسلمانان بمبئی ان کے اعزاز میں جلوس کا اہتمام کر رہے تھے۔ اقبال کا بمبئی پہنچنے کا اصل پروگرام ۳ر ستمبر کا تھا، مشہور ادیب و محقق مولانا غلام رسول مہر (ایڈیٹر، انقلاب (لاہور) نے تار کے ذریعہ روزنامہ خلافت (بمبئی) کو اقبال کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ مگر اقبال اپنی علالت کی وجہ سے مقررہ دن بمبئی نہیں پہنچ سکے۔ تاہم اس اطلاع کے مطابق کہ وہ ۳ر دسمبر کو صبح ساڑھے آٹھ بجے فرنٹیئر میل سے بمبئی تشریف لا رہے ہیں لوگ اسٹیشن پر استقبال کو گئے لیکن اقبال تشریف نہ لا سکے، تاہم مولانا شفیع داؤدی وارد بمبئی ہوئے۔[1]

[1] روزنامہ خلافت (بمبئی) ۴ر ستمبر ۱۹۳۱ء ص ۷

روزنامہ خلافت (بمبئی) کی اطلاع کے مطابق علامہ سر محمد اقبال کو اپنے پروگرام کے مطابق ۵ ستمبر کو جہاز ''ان پورا'' سے لندن روانہ ہو جانا چاہئے تھا، مگر غیر متوقع علالت کے باعث علامہ ممدوح کو اپنا یہ پروگرام منسوخ کرنا پڑا۔ اقبال نے مولانا محمد عرفان کے نام ایک خط سے اطلاع دی کہ وہ اپنے ''نکوجا'' جہاز سے جو ۱۲ ستمبر کو لندن کے لئے روانہ ہوگا، سفر کریں گے۔ اسی خط میں اقبال نے یہ بھی اطلاع دی تھی کہ اگر چہ اب بخار نہیں ہے، تاہم نقاہت باقی ہے۔ علامہ اقبال کے ۱۰ ستمبر کو فرنٹیر میل سے بمبئی پہنچنے کی بھی اطلاع دی گئی اور یہ بھی طے پایا تھا کہ شاعر مشرق، لندن روانہ ہونے تک خلافت ہاؤس میں قیام فرمائیں گے۔[1]

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے علامہ اقبال کی بمبئی آمد کے موقع پر جلوس کی تیاریاں ہو رہی تھیں مگر خلافت اخبار کی اطلاع کے مطابق:

> ''علامہ سر محمد اقبال کل ۱۰ ستمبر کو صبح ۸ بجے فرنٹیئر میل سے بمبئی سینٹرل پہنچیں گے۔ علامہ موصوف نے جلوس کیلئے ممانعت فرمائی ہے اور لکھا ہے کہ وہ اپنی علالت کے باعث اس کے متحمل نہیں ہو سکیں گے۔ لہٰذا جلوس کے تمام انتظامات ملتوی کر دیئے گئے ہیں، البتہ اسٹیشن پر استقبال کے لئے رضا کار اور مسلمان پہنچ جائیں تو مضائقہ نہیں۔''[2]

بمبئی پہنچنے سے قبل ۹ ستمبر کو مسلم یوتھ دہلی کے سکریٹری کی اطلاع کے مطابق دلی اسٹیشن سے گزرے تو کئی ہزار مسلمان دلی کے اسٹیشن پر جمع تھے اور کئی انجمنوں نے سر اقبال کی خدمت میں ایڈریس پیش کیے۔ مسلم یوتھ کے ایڈریس کے جواب میں سر محمد اقبال نے فرمایا کہ ''مسلمان خصوصاً نوجوان مسلمانوں کو ایک سچے اور پکے مسلمان کی زندگی بسر کرنی چاہئے اور انہیں چاہئے کہ وہ آئندہ جنگ کے لئے تیار رہیں، اسلئے کہ گول میز کانفرنس

---

[1] ۔ روزنامہ خلافت (بمبئی، ۸ ستمبر ۱۹۳۱ء ص ۳

[2] ۔ ایضاً، ۱۰ ستمبر ۱۹۳۱ء

میں مسلمان کسی ایسے دستور کو قبول نہ کریں گے جس میں ان کے مطالبات پورے پورے منظور نہ کئے گئے ہوں۔ [1]

اقبال کے بمبئی میں تین روزہ قیام (۱۱ر ستمبر تا ۱۳ر ستمبر ۱۹۳۱ء) اور ان کی دن بھر کی تین روزہ مصروفایت کو خلافت ہاؤس کے سیکریٹری جناب غازی محی الدین اجمیری نے محفوظ کیا ہے جو انہیں کے بیان کے مطابق حسب ذیل ہیں۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال کا بمبئی میں پر جوش استقبال

کل صبح ۸ بج کر ۵۰ منٹ پر ڈاکٹر سر محمد اقبال فرنٹیئر میل سے بمبئی پہونچے، ہزاروں کی تعداد میں مسلمانوں نے اور ان کی مختلف جماعتوں نے نعرہ ہائے تکبیر اور اقبال زندہ باد کے پر جوش اور فلک شگاف نعروں سے آپ کا استقبال کیا۔ خلافت کمیٹی کی جانب سے مولانا محمد عرفان اور دوسرے ارکان خلافت نے آپ کا خیر مقدم کیا اور ڈاکٹر صاحب کو بدقت تمام مشتاق مسلم عوام کے اس ہجوم سے نکال کر خلافت ہاؤس لے آئے جہاں آپ ۱۲ر ستمبر تک مقیم رہیں گے۔

ڈاکٹر صاحب کے مرض کا اگرچہ ازالہ ہو چکا ہے تاہم نقاہت کے اثرات ہنوز باقی ہیں یہی وجہ ہے کہ آپ نے جلوس اور ہر قسم کے پبلک مظاہرات کی ممانعت کر دی تھی۔

ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کے لئے معززین شہر جوق در جوق دار الخلافت میں تشریف لا رہے ہیں اور اس کثرت کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کو مختلف تقریبات میں شرکت کی دعوتیں دی جا رہی ہیں کہ اس محدود وقت میں جبکہ سلسلہ نقاہت بھی باقی ہے

---

[1] ۔ روزانہ خلافت (بمبئی، ۸ر ستمبر ۱۹۳۱ء ص ۳

سب کا قبول کرنا ان کے امکان سے باہر ہے۔

روزنامہ خلافت بمبئی مورخہ ۱۲ر ستمبر ۱۹۳۱ء، جلد ۱۰، نمبر ۲۱۲

[غازی محی الدین اجمیری]

دارالخلافت میں ڈاکٹر سر محمد اقبال کا پہلا دن

کل تمام دن علامہ اقبال کو سخت مشغولیت رہی ۔ شہر کے سر برآوردہ مسلمانوں نے بڑی کثیر تعداد میں دارالخلافت تشریف لاکر آپ سے ملاقات کی ۔ علامہ موصوف اگرچہ تاحال کمزور ونقیہ ہیں تاہم آپ نے ازراہِ اخلاق سب کو شرفِ ملاقات بخشا۔ اور ایک لحظہ بھی آرام نہ فرما سکے۔ البتہ مختلف تقریبات میں شرکت سے آپ عذر فرما کر ان کو واپسی پر محمول فرماتے رہے۔

ارکان وحامیانِ خلافت کے علاوہ جن اصحاب نے دن میں ملاقات فرمائی ان میں چند کے نام حسب ذیل ہیں۔

مولانا صلاح الدین سلجوقی سفیر افغانستان ۔ سیٹھ الہ بخش صاحب پرائیویٹ سکریٹری سیدنا ملا طاہر سیف الدین ۔ صالح بھائی بروڈہ والا۔ ایوب صاحب سکریٹری میمن ایسوسی ایشن ۔ سیٹھ اسماعیل صاحب مع والد اور ڈاکٹر نذیر صاحب۔ مسٹر معین الدین حارث ایڈیٹر اخبار اجمل وغیرہم۔ مسٹر لیسین نوری بیرسٹر احمد آباد دارالخلافت میں پہلے ہی سے مقیم تھے جو لمحاتِ فرصت میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ مختلف مسائل پر تبادلہ خیال کرتے رہے۔

سفیر صاحب افغانستان نے بڑے اصرار کے ساتھ شام کو کھانے پر ڈاکٹر صاحب کو بالآخر کھینچ ہی بلایا جس میں مولانا محمد عرفان، راقم الحروف غازی محی الدین اجمیری، مسٹر محمد مرزا بھی شریک ہوئے۔ بڑی پر لطف صحبت

رہی۔ ڈاکٹر صاحب اور حاضرین سفیر صاحب کی قابلیت، علمی تبحر اور ہمہ دانی سے بے حد متاثر ہوئے۔ قونصل خانہ سے ڈاکٹر صاحب کو کسی غیر محسوس فریق کے ساتھ مع ہمراہیان وسفیر صاحب اور معہ ان کے تمام اسٹاف کے محترمہ عطیہ بیگم نے اپنے تاریخی اور شاندار ایوانِ رفعت بھی کھینچ لیا۔ وہاں جو کچھ دیکھا سنا اور جو گزری ایک سماں تھا۔

بہر سو رقص بسمل بود شب جائیکہ من بودم

روزنامہ خلافت بمبئی مورخہ ۱۲ ستمبر ۱۹۳۱ء، جلد ۱۰، نمبر ۲۱۲

[غازی محی الدین اجمیری، سکریٹری مرکزی خلافت کمیٹی، بمبئی]

دارالخلافت میں علامہ اقبال کا دوسرا دن

کل صبح سے رات کے گیارہ بجے تک ڈاکٹر صاحب کو سخت مشغولیت رہی۔ سلسلہ ملاقات نصف شب تک جاری رہا اور کثرت سے شہر کے ہر طبقہ کے مسلمان ملاقات کیلئے برابر آتے رہے۔ سیدنا ملا طاہر سیف الدین۔ محترمہ عطیہ بیگم صاحبہ کے علاوہ دو ایک مقامات پر ڈاکٹر صاحب ملاقات کے لئے تشریف لے گئے۔

ہر شخص سے گفتگو ایک علیٰحدہ اور جداگانہ موضوع پر ہوتی تھی اور ڈاکٹر صاحب کا سلسلہ کلام کسی مسئلہ پر بند نہیں رہتا تھا۔ علمی سیاسی مذہبی خاص کر شاعری فلسفہ غرض یہ کہ ہر موضوع پر ڈاکٹر صاحب اس قدر حاوی ہو کر بحث فرماتے تھے کہ مخاطب دنگ رہ جاتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی ملاقات اور طرزِ تخاطب میں چھوٹے بڑے ادنیٰ اور اعلیٰ کا کوئی ایسا امتیاز نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ ہر طبقہ کے افراد سے یکسانیت اور ملاطفت کے ساتھ گفتگو فرماتے تھے۔ کل کی ملاقات کرنے والوں میں جنرل جمال پاشا اور پرنس احمد توحید نبیرہ سابق

سلطان ترکی عبدالعزیز مرحوم بھی تھے جوان دنوں بمبئی میں مقیم ہیں۔ جنرل جمال پاشا غازی انور پاشا مرحوم کے ساتھیوں میں سے ہیں اور انور پاشا مرحوم کا تذکرہ بڑے تاثر سے کرتے ہیں جو عجیب وغریب حیرت انگیز اور سبق آموز حالات پر مشتمل ہوتا ہے۔

روزنامہ خلافت بمبئی مورخہ ۱۳ر ستمبر ۱۹۳۱ء، جلد ۱۰، شمار نمبر ۲۱۳

دارالخلافت میں علامہ اقبال کا تیسرا دن اور روانگی

۱۲ر ستمبر ۱۹۳۱ء کی صبح سے دارالخلافت میں بڑی چہل پہل اور رونق تھی۔ علامہ اقبال سے ملاقات کرنے والے حضرات کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ روانگی سے چند منٹ قبل خلافت کے خصوصی نامہ نگار کی درخواست پر ڈاکٹر صاحب نے اخبار خلافت کے ذریعہ مسلمانوں کو ذیل کا پیغام دیا ہے۔

پیغام

''اسلامی تعلیم کے تحت مسلمانوں کو لازم ہے کہ بنی نوع انسان کے کسی فرد بشر کے ساتھ بھی تعصب اور تنگ نظری کا برتاؤ روا نہ رکھیں۔ اس کا سینہ فراخ اور بے کینہ ہو کسی قسم کی توہم پرستی کو اپنے دل میں جگہ نہ دے۔ میرا ایمان ہے کہ ایک مومن کے دل کی وسعتیں تمام بنی نوع انسان کو احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ اسلام کیا ہے ایک عالمگیر اتحاد انسانی یہ ایک حقیقت ہے جو تمام مسلمانوں کو ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے۔''

ساڑھے دس بجے ڈاکٹر صاحب کارکنانِ خلافت اور اپنے احباب خاص کی ایک کثیر جماعت کے ساتھ دارالخلافت سے برآمد ہوئے اور جہاز

پر پہنچے۔ بیلرڈ پییر پر رضا کاران خلافت اور دوسرے مسلمانوں کی کثیر تعداد الوداع کہنے کو موجود تھی۔ اسی جہاز سے نواب احمد سعید خاں رئیس چھتاری ہوم ممبر یوپی گورنمنٹ۔ مسٹر اے کے فضل الحق اور مسٹر مشیر حسین قدوائی بھی انگلستان تشریف لے جارہے تھے۔ ایک بجے جہاز روانہ ہوا۔

(روزنامہ خلافت بمبئی مورخہ ۱۵ر ستمبر ۱۹۳۱ء، جلد ۱۰، نمبر ۲۱۴)

علامہ اقبال : اسلام اور ملوکیت

اقبال شاعر اور فلسفی ہونے کے علاوہ غیر معمولی عالمگیر شہرت یافتہ دانشور تھے اور اسلام اور اس سے متعلقہ سارے علوم پر گہری نظر رکھتے تھے۔ وہ سیاسی نظریات مثلاً اشتراکیت اور ملوکیت کے سیاسی پہلوؤں اور نظریات کا گہرا علم رکھتے تھے۔ اکتوبر ۱۹۳۱ء میں جب آپ بمبئی میں مقیم تھے اور دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کیلئے لندن روانہ ہونے والے تھے، اس موقع پر شہر بمبئی کی مقتدر ہستیوں نے اقبال سے ملاقات کی اور خصوصاً اسلام اور ہندوستانی مسلمانوں سے متعلق اور ان کے سیاسی مستقبل کے بارے میں تبادلہ خیال کیا۔ ''بمبئی کرانیکل'' اس عہد کا مقبول انگریزی روزنامہ تھا۔ بی۔ جی۔ پارنیمن جو پہلے کلکتے کے مشہور اخبار اسٹیٹسمن کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے، مشہور قومی رہنما سر فیروز شاہ مہتا کی دعوت پر بمبئی تشریف لائے اور بمبئی سے نکلنے والے پہلے قوم پرست اخبار ''بمبئی کرانیکل'' کے ایڈیٹر بنے[1] پارنیمن کے زمانہ ادارت ہی میں مشہور صحافی سید عبداللہ بریلوی بھی ''بمبئی کرانیکل'' میں بحیثیت صحافی شامل ہو گئے۔ جب ہارنیمن کو جبراً انگلستان بھیج دیا گیا تو عبداللہ بریلوی کو

[1] ۔ضیاء الدین برنی: عظمتِ رفتہ۔ تعلیمی مرکز کراچی ص ۴۲۹

''بمبئی کرانیکل'' کا قائم مقام ایڈیٹر مقرر کیا گیا اور بعد میں انگلستان کے مشہور ادیب محمد مارماڈیوک پکتھال اس کے ایڈیٹر بنے۔ پکتھال کے ایڈیٹری سے مستعفی ہوجانے کے بعد سید عبداللہ بریلوی کو مستقل طور پر اس اخبار کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ سید عبداللہ بریلوی ۱۹ر جنوری ۱۹۴۹ء یعنی انتقال تک اس قومی اخبار کے ایڈیٹر رہے۔[1]

''بمبئی کرانیکل'' میں اردو زبان کا بھی عمل دخل تھا۔ بریلوی صاحب کے مشورے پر اس میں اردو اخبارات کے اقتباسات بھی شائع ہوتے تھے۔ یہ اقتباسات ''خوشہ چینیاں'' کے زیرعنوان ضیاء الدین برنی لکھا کرتے تھے۔[2] جو ایک مقتدر ادیب اور عالم ہونے کے علاوہ حکومت بمبئی میں چیف ٹرانسلیٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ اس میں اردو زبان وادب کے بارے میں اور اس کے شاعروں اور ادیبوں کے بارے میں مضامین، نظموں کے تراجم اور انٹرویوز وغیرہ باقاعدگی سے شائع ہوتے تھے۔ ۱۹۳۱ء میں اقبال کی لندن روانگی کے وقت ''بمبئی کرانیکل'' کے نامہ نگار نے بھی اقبال سے ملاقات کی۔ یہ گفتگو اخبارِ ہٰذا کے علاوہ روزنامہ خلافت بمبئی جمعہ ۹/ اکتوبر ۱۹۳۱ء میں بھی شائع ہوئی جو درج ذیل ہے۔

اسلام۔ ملوکیت اور حضرت علامہ اقبال

اہم مسائلِ اسلامیہ کے متعلق شاعرِ اسلام کے گرانقدر خیالات

مجھے دنیا کے کسی فرقہ یا قوم سے کوئی بغض یا عناد نہیں ہے۔ میری تو خواہش صرف یہ ہے کہ اسلام کے ابتدائی زمانہ کی زندگی پھر عود کر آئے۔ میں اہلِ ہند کو امن وسکون کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں اور میرا عقیدہ ہے کہ ایسا اس صورت میں بھی ناممکن ہے کہ ہر ایک فرقہ اپنی تہذیب وتمدن اور انفرادی حیثیت کو برقرار رکھے۔ یہ وہ خیالات تھے جن کا اظہار سر محمد اقبال نے گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے ولایت کو روانہ ہونے سے پیشتر اخبار ''بمبئی کرانیکل'' کے نمائندۂ خصوصی سے ملاقات کے دوران میں کیا۔ سر موصوف نے ہندوستانی مسائل پر بحث ومباحثہ کرنے سے اجتناب کیا۔ البتہ دیگر اہم مسائل پر جن کا

[1]۔ ضیاء الدین برنی: عظمتِ رفتہ۔ تعلیمی مرکز کراچی ص ۲۹۷

[2]۔ ضیاء الدین برنی: عظمتِ رفتہ۔ تعلیمی مرکز کراچی ص ۲۹۹

مطالعہ ''مدت العمر'' سے کر رہے ہیں، آپ نے نہایت آزادی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار فرمایا:

تحریکِ اتحادِ اسلامی

یہ دریافت کئے جانے پر کہ تحریکِ اتحادِ اسلامی (پان اسلامزم) کے متعلق آپ کے خیالات کیا ہیں؟ سر محمد اقبال نے فرمایا کہ تحریکِ اتحادِ آسلامی کا استعمال دو معنوں میں ہوتا ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے پان اسلامزم (Pan Islamism) اتحادِ اسلامی کا لفظ ایک فرانسیسی اخبار نویس کی ایجاد ہے اور اخبار نویس مذکور نے اس لفظ کو جس معنی میں استعمال کیا تھا اس معنی میں اس کا وجود اس کے دماغ کے علاوہ اور کہیں بھی نہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ فرانسیسی اخبار نویس اس خطرے کو متشکل کر کے دکھانا چاہتا تھا جس کے متعلق اسے یقین تھا کہ وہ دنیائے اسلام میں موجود ہے ''زرد خطرہ'' کے الفاظ کے اتباع میں اس لفظ کو بھی ایجاد کیا گیا تھا تا کہ اس طرح اسلامی ممالک میں یورپین اقوام کے جارحانہ اقدام کو جائز قرار دیا جا سکے۔ بعد میں پان اسلامزم سے مراد وہ سازش تھی جس کا مرکز قسطنطنیہ کو قرار دیا گیا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ دنیا کے مسلمان یورپین سلطنتوں کے مقابلے میں اسلامی حکومتوں کے اتحاد کی اسکیم تیار کر رہے ہیں لیکن میرے خیال میں کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر براؤن آنجہانی نے پورے طور پر یہ ثابت کر دیا تھا کہ اس معنی میں پان اسلامزم کا کہیں وجود بھی نہیں ہے۔ نہ تو قسطنطنیہ میں نہ کسی دوسری جگہ۔ پان اسلامزم کا ایک اور بھی مفہوم ہے اور اسی معنی میں جمال الدین افغانی نے اس کو استعمال کیا تھا۔ مجھے علم نہیں ہے کہ آیا انھوں نے پان اسلامزم کا لفظ استعمال کیا تھا۔ بہر حال ترکی، افغانستان اور ایران کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ یورپ کی استعماریت کے خلاف متحد رہیں۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ جدید بیداری عنقریب استعماریت اور بالشویزم میں اہم تغیرات پیدا کر دے گی۔ وسیع سلطنتوں کا زمانہ ختم ہو چکا ہے اور بالشویزم کے اصولوں میں بھی تغیرات رونما ہو رہے ہیں۔ اقتصادی نقطہ ہائے نظر میں بنیادی اختلافات کے باعث برطانیہ اور روس میں جنگ کا بہت زیادہ امکان ہے۔ اگر یہ جنگ وقوع میں آئی تو جملہ صحیح النظر اشخاص کی ہمدردی اس فریق کی جانب ہوگی جو انصاف کا مؤید ہوگا۔ یہ دریافت کئے جانے پر کہ آیا وہ برطانوی استعماریت کو غیر الوہیت قرار دیتے ہیں سر محمد اقبال نے فرمایا کہ جملہ سلطنتیں جو

دوسروں کو تباہ و برباد کر کے جلب منفعت میں مصروف ہیں غیر اولہیت ہیں۔ سر محمد اقبال سے یہ بھی دریافت کیا گیا کہ ان کے لڑکے نے ایک بار سر فرانسیس ینگ ہسبنڈ کے نام ایک مکتوب میں جو یہ تحریر کیا تھا کہ اسلام سے مراد بالشویزم ہشت خدا ہے آیا اس سے وہ بھی اتفاق کرتے ہیں۔ اس کا جواب سر محمد اقبال نے یہ دیا کہ اسلام ایک اشتراکی (سوشلسٹ) مذہب ہے۔ قرآن مجید کی تعلیمات کامل اشتراکیت اور ذاتی ملکیت دونوں کے درمیان ہیں۔ روس نے بھی ذاتی ملکیت کے اصول کو ایک حد تک تسلیم کیا ہے۔ آپ نے اس امر پر خاص طور پر زور دیا کہ قرآن پاک اس امر کی سخت ممانعت کرتا ہے کہ آراضی پر ذاتی ملکیت کی حیثیت سے قبضہ رکھا جائے۔

اسلام اور قومیت:

یہ سوال کئے جانے پر کہ وہ اپنے ان نکتہ چینوں کو کیا جواب دیتے ہیں جو ان کے طریقۂ کار کو ان کی شاعری میں ظاہر کئے ہوئے خیالات کے متضاد قرار دیتے ہیں۔ سر اقبال نے فرمایا کہ میری تحریروں سے میرے متعلق رائے قائم کی جانی چاہئے۔ لیکن میرے نکتہ چینوں میں سے بہت کم لوگ میری تحریروں کو پڑھتے یا سمجھتے ہیں۔ بہر حال اس میں شبہ نہیں ہے کہ قومیت کے متعلق میرے خیالات میں تبدیلی رونما ہوگئی ہے، میں طالب علمی کے زمانہ میں ایک پر جوش قوم پرست تھا، لیکن اب میں قوم پرست نہیں رہا، اس تغیر کا سبب غور و فکر ہے۔ اس پر جب آپ سے سوال کیا گیا کہ آخر آپ قومیت کے خلاف کیوں ہو گئے تو آپ نے فرمایا کہ اسلام کسی عقیدہ کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک معاشرتی نظام ہے جس نے رنگ کے مسئلہ کو حل کر دیا ہے۔ یہ نظام سارے انسانوں کی توجہ ایک خاص راستہ کی جانب منعطف کرانا چاہتا ہے۔ اس کا مقصد جملہ انسانوں کو متحد بنا کر انہیں ایک لڑی میں منسلک کرنے کا ہے، اور چونکہ قومیت کا جو مفہوم ہے اور جس معنی میں اس پر عمل کیا جاتا ہے وہ مذکور الصدر مقصد کے حصول میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے، اس لئے میں قومیت کا مخالف ہوں۔

عرب ممالک کا فیڈریشن:

عرب ممالک کا فیڈریشن کے امکان سے بحث کرتے ہوئے سر اقبال نے فرمایا کہ ''میں عرب سلطنتوں کے فیڈریشن کا زبردست حامی ہوں لیکن اس کے راستے میں بعض نہایت

ہی اہم مشکلات درپیش ہیں مجھے عربی زبان سے بہت کچھ توقعات ہیں اور میرے خیال میں بھی ایک مشرقی زبان ایسی ہے جس کا مستقبل نہایت ہی شاندار نظر آرہا ہے۔عرب اقوام کو ایک رشتہ میں منسلک کرنے میں عقیدہ کی یکسانیت کے بعد عربی زبان ہی سب سے زیادہ امداد کا باعث ہوسکتی ہے۔حجاز کی حالت اس وقت نہایت ہی غیر اطمینان بخش ہے اور میں عربی ممالک کے فیڈریشن کے مستقبل کے متعلق کوئی حکم نہیں لگا سکتا۔اگر اسلامی ممالک اسلامی تعلیم پر عامل رہیں تو وہ بنی نوع انسان کی بہت بڑی خدمت کرسکتے ہیں۔میرے خیال میں مسلمانانِ ہند اسلام کے مستقبل کی تعمیر میں نہایت ہی نمایاں اور اہم پارٹ لیں گے۔

اسلام کا زیادہ بھروسہ جدید نسل پر ہے اگر علماء ان اقتصادی وسیاسی مسائل کو سمجھنے کی کوشش کریں جن کا دنیائے اسلام کو آج سامنا کرنا پڑرہا ہے تو اسلام کے مستقبل کی تعمیر میں زمانۂ آغازِ اسلام کے متعلق ان کی معلومات بہت زیادہ مفید ثابت ہوسکتی ہیں۔جمعیت واقوام کانفرنسوں کی لغویت کو ظاہر کرنے میں آپ نے سب سے زیادہ نمایاں حصہ لیا ہے، تاہم آپ کو گول میز کانفرنس سے بہت کچھ امیدیں ہیں۔کیا آپ اس معمہ کو مہربانی فرما کر سمجھائیں گے؟

علامہ سے جس وقت یہ سوال کیا گیا تو آپ نے اسے ٹال دیا۔اور اپنے ہر وقت کے ساتھی یعنی حقہ کی جانب متوجہ ہوگئے۔

(روزنامہ خلافت، بمبئی جمعہ ۹/ اکتوبر ۱۹۳۱ء، ص ۵)

اقبال ایشیاء کے ملک الشعراء

انگلستان میں اقبال کے اعزاز میں ایک یادگار تقریب

بتاریخ ۶ رنومبر ۱۹۳۱ء

اقبال کی شاعری میں مختلف رجحانات پائے جاتے ہیں۔ وہ ایک باکمال شاعر اور فلسفی تھے۔ اسی کے ساتھ انہیں عمرانی اور معاشرتی مسائل سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ انہیں اپنے وطن عزیز سے گہری دلچسپی تھی جس کے ثبوت میں متعدد نظمیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ جہاں انہیں اپنے وطن سے محبت تھی وہیں پر انہیں اپنی ملت سے بھی عشق تھا۔ وہ نہ صرف ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل کے لئے فکر مند تھے بلکہ عالم اسلام کے مستقبل کے بارے میں بھی فکر مند تھے۔ اقبال کو ہندوستان کی سیاست سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ سیاست سے ان کی دلچسپی نظریاتی سطح پر رہی۔ انھوں نے کبھی سیاست کو عملاً نہیں برتا، چنانچہ اپنے ایک دوست کو لکھتے ہیں ؎

یہ عقدہ ہائے سیاست تجھے مبارک ہوں
کہ فیض عشق سے ناخن مرا ہے سینہ خراش

اس کے باوجود اقبال کی زندگی میں ایک ایسا بھی وقت آیا کہ انھوں نے عملی سیاست میں بھی دلچسپی لینی شروع کی اور اپنے احباب کے اصرار پر نومبر ۱۹۲۶ء میں پنجاب کی لیجسلیٹو کاؤنسل کی ممبر کے لئے الیکشن لڑا اور منتخب بھی ہوئے۔ اس کے بعد ۱۹۳۰ء میں انھوں نے

آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ جلسے کی صدارت قبول فرمائی اور پھر مسلم کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے۔ اس زمانے میں مسلمانانِ ہند انتہائی نازک دور سے گزر رہے تھے۔ اقبال نے اس نازک دور میں ہر ممکن طریقے سے مسلمانوں کی رہنمائی کی۔

اقبال کی شہرت اور مقبولیت ہندوستان اور عالم اسلام میں دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ عام اردو داں طبقہ میں ان کی شاعری ان کے دل کی دھڑکن بن گئی تھی۔ ان کے خلوص اور رہنمائی میں بھی کسی کو شک وشبہ نہیں تھا، یہی وجہ ہے کہ اس دردمند کے کلام و پیام سے حوصلہ افزا فکری توانائی حاصل کرتے تھے اور انہیں سیاسی رہنما اور روحانی پیشوا سمجھتے تھے۔ اقبال کی اس شہرت اور مقبولیت کی وجہ سے وہ ارباب حکومت سے قریب ہو گئے اور سرکاری امور میں مسلمانوں کی نمائندگی کرنے لگے۔ جب ہندوستانی مسائل کے پیش نظر اور تحریکِ آزادی کی گرم جوشی کی وجہ سے حکومت نے ہندوستان کے لئے دستوری اصطلاحات کو ضروری سمجھا تو اپنے مقصد کے حصول کے لئے لندن میں گول میز کانفرنسوں کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس سلسلے کی پہلی گول میز کانفرنس ۱۹۳۰ء میں لندن میں منعقد ہوئی۔ اس پہلی گول میز کانفرنس میں جو لندن میں ۱۲ر نومبر ۱۹۳۰ء میں شروع ہوئی کانگریس کے لیڈر جو ایک سال قبل Civil disobedience compain میں حصہ لینے کی وجہ سے قید و بند کی زندگی گزار رہے تھے، شریک نہیں ہو سکے البتہ مسلم لیگ کے رہنماؤں نے پہلی گول میز کانفرنس میں شرکت کی جن میں سر آغا خان، مولانا محمد علی، محمد علی جناح اور میاں محمد شفیع کے نام بہت اہم ہیں۔ اقبال اس کانفرنس میں مدعو نہیں تھے۔ اسکانفرنس نے کسی حد تک ترقی کی اور اس بات پر اتفاق رائے ہوا کہ نیا دستور وفاقی (Federal) ہونا چاہئے۔ البتہ لوگوں کا عام خیال یہ تھا کہ اس اتفاقِ رائے کی اصل وجہ اس کانفرنس کی عدم شرکت تھی۔

دوسری گول میز کانفرنس لندن میں منعقد ہوئی جس میں اقبال مدعو تھے۔ یہ کانفرنس سینٹ جیمس پیلیس (St. James Palace) میں منعقد ہوئی۔ اقبال دیگر سیاسی لیڈران کے مقابلہ اپنی ایک ممتاز انفرادی شخصیت رکھتے تھے، مگر لندن میں علمی و ادبی حلقوں نے ان کی آمد کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ ولیم روتھینسٹین (William Rothenstein) نے اپنی

کتاب Men and Memories میں لکھا ہے:

When Sir Mohammed Iqbal, the most eminent among Muslim poets, Philosophers came over for the Indian Round Table Conferance in 1931, a little notice was taken of him. He was a little sore that non of the English Philosophers seemed aware of his presones in London. When in Paris, he wrote to me later : " I met Bergason we had an exteramly interesting conversation on philosophies subjects. Our converse .... lasted two hours. Bergason is old and very ill he does not see people but was good enough to make exception in my case". I wish some of our English philosophers had given some of their time to this eminent visitor......"

ولیم روتھینٹسٹین (William Rothenstein) کے مذکورہ بیان کے مطابق انگریز فلسفیوں نے چاہے اقبال کی لندن میں آمد کو کوئی اہمیت نہ دی ہو لیکن گول میز کانفرنس میں شریک مندوبین کے اعزاز میں ۶ رنومبر ۱۹۳۱ء کو ہز ہائنس سر آغا خان کی صدارت میں ایک دعوت طعام دی گئی جس میں لندن میں ایک ''اقبال لٹریری ایسوسی ایشن'' Iqbal Literery Association کی بنیاد رکھی گئی۔[1] یہ اقبال کیلئے بہت بڑا اعزاز تھا۔ ممکن ہے اس کا فیصلہ اس سے قبل ہی کیا گیا ہو اسلئے کہ ۶ رنومبر ہی کی شام چار بجے اقبال ایسوسی ایشن کی جانب سے علامہ اقبال کے اعزاز میں ایک عظیم الشان عصرانے کا بھی انتظام کیا گیا۔ یہ تقریب بے انتہا کامیاب رہی اور رپورٹوں کے مطابق کم وبیش چار سو معزز ومنتخب اصحاب اس میں شریک ہوئے۔ گول میز کانفرنس کے تقریباً تمام مندوبین اس میں شریک تھے۔ اس میں جو ممتاز شخصیتیں شریک ہوئیں ان میں سر تیج بہادر سپرو، مولانا شوکت علی، مسز سروجنی نائڈو، سر اکبر حیدری، مرزا سر اسمٰعیل، گاندھی جی، سردار اجل سنگھ، مولانا شفیع داؤدی، ڈاکٹر شفاعت احمد خان، ہز ہائنس سر آغا خان، سر محمد شفیع، چودھری ظفر اللہ خان، نواب مہر شاہ، مسٹر آئنگر اور متعدد دوسرے

[1] روزنامہ خلافت، بمبئی، شنبہ ۲۸ رنومبر ۱۹۳۱ء، ص ۸

اصحاب کے علاوہ معززین میں سے پروفیسر ڈاکٹر نکلسن (مترجم اسرار خودی) سر مائکل ووڈ وائر، جنرل البنی، سر ہیوبرٹ ایکسن، ایک مخلوص نوعمر سرونٹ، مدام فاطمہ العابد، سر عمر حیات خان ٹونہ، مسٹر الما لطیفی، نواب لیاقت علی خان، مسٹر شعیب قریشی، ملک غلام محمد، مولوی فرزند علی صاحب، امام مسجد احمدیہ لندن، مولوی عبدالمجید صاحب امام ووکنگ نیز دونوں اصحاب کے معاونین، سر عبدالقادر، شیخ حافظ وہبہ سفیر دولت حجاز ونجد، ایونڈ فرینک ہارٹ، مسٹر خالد شیلڈرک، مس ماریٹ فاکھرسن، مسٹر عبداللہ یوسف علی، مسٹر زاہد علی، سید امجد علی شاہ، اور بہت سے اکابر علم وفضل جن میں خواتین بھی کافی تعداد میں شامل تھیں جن کے اسماء معلوم نہ ہوسکے۔ اسکے علاوہ ہندوستانی اور غیر ہندوستانی طلبہ کی ایک کثیر تعداد اس تقریب میں شریک ہوئی۔ چودھری رحمت علی، مسٹر عبدالرحیم اور متعدد اصحاب کیمبرج سے، اسی طرح متعدد اصحاب آکسفورڈ سے تشریف لائے تھے۔[1] بقول مولانا غلام رسول مہر ''ایسی تقریبات لندن میں اتنا بڑا اجتماع اور اتنے منتخب اصحاب کا اتنا بڑا اجتماع بہت کم ہوا ہوگا'' پارٹی کا بندوست بقول مولانا مہر ''والڈاف ہوٹل'' میں کیا گیا تھا جو ایلڈوِچ (Eldwich) میں لندن کا ایک مشہور ہوٹل ہے۔ ابتدا میں سارے مدعوئین ایک بڑے کمرے میں جمع ہوئے اور جناب سر عمر حیات خان ٹونہ ہر آنے والے سے حضرت علامہ سے تعارف کراتے رہے۔ اس کے بعد چائے کا دور شروع ہوا۔ چائے کا انتظام دو بڑے ہالوں میں جو ایک دوسرے سے متصل تھے کیا گیا تھا۔[2]

اقبال کے اعزاز میں اس تاریخی جلسہ میں جو لندن میں منعقد ہوا۔ صدارت سر شیخ عبدالقادر نے فرمائی۔ سر عبدالقادر نے اس موقع پر اپنی افتتاحی تقریر میں اس پر فخر وانبساط کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ ''آج سرزمین مشرق کا سب سے باشاعر اور فلاسفر ہمارے سامنے موجود ہے۔ جس کے اعزاز میں ہم سب یہاں جمع ہوئے ہیں۔ سر عبدالقادر نے اپنے ابتدائیہ کلمات کے بعد اقبال کے ٹرینٹی کالج (Trinity College) کیمبرج میں استاد مشہور مستشرق اور انگریزی میں اقبال کے فلسفیانہ فارسی شہکار اسرارِ خودی کے مترجم پروفیسر آر۔

[1] ۔روزنامہ خلافت، بمبئی، شنبہ ۲۸ نومبر ۱۹۳۱ء، ص ۸

[2] ۔روزنامہ خلافت، بمبئی، شنبہ ۲۸ نومبر ۱۹۳۱ء

اے۔ نکلسن سے درخواست کی کہ وہ حاضرین سے اقبال کا تعارف فرمائیں۔ انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ تعارف کا یہ حق پروفیسر نکلسن کو یوں بھی ہے کہ اقبال کے کلام کو سرزمینِ مغرب سے روشناس کرانے کا کام بھی انہیں کا ہے۔[1]

اس تقریب میں پروفیسر نکلسن نے ایک مختصر مگر نہایت عمدہ تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''آج سے تقریباً ۲۵ سال پیشتر میں اقبال سے کیمبرج میں ملا تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں کوئی شخص کسی نوجوان کے شاندار مستقبل اور آئندہ ہونے والی عزت وشہرت کا اندازہ نہیں کرسکتا، مگر اقبال کے متعلق اس وقت بھی یقین ہوتا تھا کہ وہ بڑے مرتبے پر پہنچیں گے اور بقول سعدی ؎

بالائے سرش ز ہوش مندی
می یافت ستارۂ بلندی

اس کے بعد ڈاکٹر نکلسن نے اقبال کی شاعری کے بارے میں مختصراً اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ فلسفے کے دقیق مسائل کو نہایت دلکش اور دل فریب اشعار میں پیش کرتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ ایک خاص پیغام پہنچا رہے ہیں جس میں روحانیت کا پہلو غالب ہے اور جو دہریانہ مادیت کے خلاف ہے۔''

پروفیسر نکلسن نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ''ابتداء میں لوگوں نے یہ سمجھا تھا کہ وہ ایک دوسرے نطشے (Nietzshe) ہیں یا نطشے کے خیالات وافکار کو فارسی کا جامہ پہنا رہے ہیں، لیکن عمیق مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ڈاکٹر اقبال کی تعلیم دوسری ہے۔ حقیقتاً ان کی شاعری کا مقصد بہ اصطلاحِ مولانا روم ''جہادِ اکبر'' ہے۔[2]

اس موقع پر انگریزی میں اقبال کی خدمت میں ایک ''سپاس نامہ'' بھی پیش کیا گیا۔ یہ سپاس نامہ ''اقبال لٹریری ایسوسی ایشن'' (Iqbal Literary Association) کے سکریٹری جناب نیاز محمد خان نے پڑھا۔ یہ ایڈریس/ سپاس نامہ جو چھپا ہوا تھا، حاضرین میں

---

[1] ۔ روزنامہ خلافت، بمبئی، شنبہ ۲۸ نومبر، ۱۹۳۱ء

[2] ۔ روزنامہ خلافت، بمبئی، شنبہ ۲۸ نومبر، ۱۹۳۱ء

تقسیم کیا گیا۔ اقبال کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے اسے خوشخط لکھوا کر پر تکلف چوکھٹے میں لگایا گیا تھا۔ اس سپاس نامہ کا اردو ترجمہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

بخدمت علامہ سر محمد اقبال مدظلہ العالی

ہم اس لٹریری ایسوسی ایشن کے ارکان جو جناب کے اسم گرامی سے منسوب ہے۔ آپ کی امروزہ تشریف آوری کی تقریب سعید پر اپنے انتہائی جذبات مسرت و امتنان کا اظہار کرتے ہیں۔ ہمارا احساس ہے کہ جناب نے دنیا کو ایک ایسا پر امید پیغام دیا ہے جو اس کو یاس و نومیدی کی موجودہ حالت سے نجات دے سکتا ہے، لیکن ہم یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ ابھی اس پیغام کی وہ اشاعت و توسیع نہیں ہوئی جس کا وہ مستحق ہے۔ ابھی دنیا اس کی گہرائیوں تک نہیں پہنچی اور اسے جناب کے پیغمبرانہ انتباہات اور ہمت افروز پہلوؤں کی اہمیت کا احساس نہیں ہوا۔ اس لئے ہمارا نصب العین یہ ہے (کہ ہم) مشرق بیداری کی اس صدائے پیہم کے مطالعے اور تفہیم میں مغرب کی امداد کریں۔

جناب والا!

آپ جہاں ایک عصرِ جدید کے بلند بانگ پیغام رساں ہیں وہیں ماضیٔ رفتہ کی شوکت کے فسانہ خواں بھی ہیں ہیں۔ ہمارے بہت سے رہنماؤں نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ انھوں نے آپ کی ہدایت و رہنمائی سے ''عرفان نفس'' حاصل کیا ہے۔ آپ ہمارے اہل فکر کو غفلت کی گہری نیند سے بیدار کرنے اور عام تماشائیوں میں اضطراب و ہیجان پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ آپ نے دنیا کے سامنے اس کی ذہنی، اقتصادی اور معاشرتی مسائل کی کلید پیش کی ہے۔ آپ نے تخیل کی دنیا میں انقلاب پیدا کر کے اور شعر کو عمیق خیالات و جذبات کا آلہ بنا کر شاعری پر احسان عظیم فرمایا ہے۔ مشرق و مغرب کا وہ فلسفہ جس کو اب تک گہرا مطالعہ کرنے والے اشخاص ہی نے بلا شرکت غیرے اپنی ملکیت بنا رکھا تھا، آپ نے اس کو دلفریب اشعار اور سرود و آہنگ کے قالب میں ڈھال کر عامۃ الناس کی دلفریبی اور فکر افروزی کا ذریعہ بنایا ہے۔ آپ کی ساری حیات ادبی اس بے پناہ ملحدانہ مادیت کے خلاف ایک جرأت آموز جہاد ہے جس نے قومیت پرستی کے لباس میں مغرب کی تمام قوتوں کو اپنا غلام

بنا رکھا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ عصرِ حاضر کے کسی مصنف نے اس جہاد میں آپ سے زیادہ جسارت سے کام نہیں لیا ہے۔

تمام جلیل القدر معلمین فکر کی طرح جو اپنے زمانے سے بہت آگے نظر ڈالنے کے خوگر ہوتے ہیں، آپ نے ہمیشہ ایسے انسانوں کے فقدان پر اظہارِ تاسف کیا ہے، جو آپ کے بلند تخلیات کے معنی سمجھ سکیں۔ لیکن ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ جن اسرارِ حیات کا آپ نے انکشاف کیا ہے ان سے اب آہستہ آہستہ لوگ آشنا ہونے لگے ہیں۔ آپ نے اپنے اشعار میں جن بلند نظریات کو پیش کیا ہے اور اپنی نثر میں ایک فلسفی کی حیثیت سے بیان فرمایا ہے وہ اپنا اثر کر رہے ہیں اور ان تخیلات کی آخری ظفر مندی میں اب کوئی شبہ باقی نہیں رہا۔ ہمارا فرض اور حق ہے کہ ہم ان تخیلات کی تفسیر میں اپنی قوم اور دنیا کی دوسری اقوام کی مدد کریں۔

آپ کے تمام مداحوں کی دلی دعا ہے کہ آپ مدتِ دراز تک علم و دانش کا نور پھیلاتے رہیں اور انسانی زندگی کو بہتر مدارج اور ارتقاء تک پہنچانے کی ہدایت کرتے رہیں۔''

لندن، ۶/نومبر

آپ کے ممنون و مدّاحین ارکانِ اقبال لٹریری اسوسی ایشن

مذکورہ ''سپاس نامہ'' کے بعد علامہ اقبال کو اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی۔ انھوں نے اس اعزازی جلسہ کے انعقاد کے لئے ابتدائی کلمات اور شکریے کے بعد حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''۱۹۰۵ء میں جب میں انگلستان آیا تھا تو میں محسوس کر چکا تھا کہ مشرقی ادبیات اپنی ظاہری دلفریبیوں اور دلکشیوں کے باوجود روح سے خالی ہیں جو انسانوں کے لئے امید و ہمت اور جراٴتِ عمل کا پیغام ہوتی ہیں اور جسے زندگی کے جوش اور ولولے سے تعبیر کرنا چاہیے۔ یہاں پہنچ کر یورپی ادبیات پر نظر ڈالی تو اگرچہ وہ ہمت افروز نظر آئیں لیکن ان کے مقابلے کیلئے یورپ میں سائنس کھڑی تھی جو ان کو افسردہ بنا رہی تھی۔ اور ۱۹۰۸ء میں انگلستان سے واپس گیا تو میرے نزدیک یورپی ادبیات کی حیثیت بھی تقریباً وہی تھی جو مشرقی ادبیات کی تھی۔ ان حالات میں میرے دل میں کشمکش شروع ہوئی کہ ان ادبیات

سے متعلق اپنی رائے ظاہر کرنی چاہئے اور روح پیدا کرنے کے لئے کوئی نیا سرمایۂ حیات فراہم کرنا چاہئے۔ میں اپنے وطن گیا تو یہ کشمکش میرے دل میں جاری تھی اور میں اس میں اس درجہ منہمک تھا کہ دو تین سال تک میرے عزیز دوستوں کو بھی علم نہ تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں سنہ ۱۹۱۰ء میں میری اندرونی کشمکش کا ایک حد تک خاتمہ ہوا اور میں نے فیصلہ کیا کہ اپنے خیالات ظاہر کر دینے چاہئیں لیکن اندیشہ تھا کہ ان سے غلط فہمیاں پیدا ہوں گی۔ بہر حال میں نے ۱۹۱۰ء میں اپنے خیالات کو مدنظر رکھ کر اپنی مثنوی ''اسرارِ خودی'' لکھنی شروع کی۔ اردو کو چھوڑ کر فارسی میں شعر کہنا شروع کرنے کے متعلق اب تک مختلف لوگوں نے مختلف توجیہات پیش کیں۔

فارسی زبان کیوں اختیار کی؟

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آج میں یہ راز بھی بتا دوں کہ میں نے کیوں فارسی میں شعر کہنے شروع کیے۔ بعض اصحاب خیال ظاہر کرتے رہے ہیں کہ فارسی زبان میں نے اس لئے اختیار کی کہ وہ میرے خیالات زیادہ وسیع حلقے میں پہنچ جائیں حالانکہ میرا مقصد اس کے بالکل برعکس تھا۔ میں نے اپنی مثنوی ''اسرارِ خودی'' ابتداء میں صرف ہندوستان کے لئے لکھی تھی اور ہندوستان میں فارسی سمجھنے والے کم تھے۔ میری غرض یہ تھی، جو خیالات میں باہر پہنچانا چاہتا ہوں وہ کم از کم حلقے تک پہنچیں۔ اس وقت مجھے یہ خیال بھی نہ تھا کہ یہ مثنوی ہندوستان کی سرحدوں سے باہر جائے گی۔ یا سمندر چیر کر یورپ جائے گی۔ بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ اس کے بعد فارسی کی دلکشی نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا اور میں اسی میں شعر کہتا رہا۔

معترضین کی غلط فہمیوں کی اصلاح

میں نے جو خیالات ظاہر کئے تھے ان پر ابتداء میں بہت سے اعتراض ہوئے، حتیٰ کہ میری نسبت کہا گیا کہ میں دہریت کی تبلیغ کر رہا ہوں اور یہ اعتراض مسیحی کلیسا کے ایک رئیس کی طرف سے ہوا۔

سائنس کے مقابلے میں یورپی ادبیات کی کمزوری اور انحطاط کا مجھے جو احساس ہوا اسے میں نے مختلف اشعار میں پیش کیا ہے۔ مثلاً:

عشق ناپید وخرد مے گذرش صورتِ مار
کرچہ در کاسۂ زر لعل روانی دارد

اس کے بعد علامہ اقبال نے فرمایا کہ میں مکرر آپ حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور خوش ہوں کہ اگرچہ میرے ساتھ کوئی فوج نہیں ہے تاہم رفقاء کی ایک کثیر جماعت میرے سامنے ہے۔آپ اپنی تعداد کو بڑھایئے۔ میں آپ کو وہی نصیحت کرتا ہوں جو میں نے اپنے فرزند (جاوید اقبال اطال اللہ عمرہ) کو کی ہے، یعنی ؎

کم خور وکم خواب وکم گفتار باش
گرد خود گردندہ چوں پرکار باش

اور آپ کے سامنے میں وہی بات دہراتا ہوں جو میں نے صوفیوں سے کہی ہے ؎

زمن گو صوفیانِ باصفا را
خدا جویانِ معنی آشنا را
غلام ہمت آں خود پرستم
کہ بانورِ خودی بیند خدارا

بقول مولانا غلام رسول مہر جو اس تہنیتی جلسہ میں شریک تھے اور اقبال کے تعلق سے اقبال کے سفرِ لندن کی رپورٹیں اپنے اخبار ''انقلاب'' (لاہور) اور روزنامہ ''خلافت'' (بمبئی) کو بھیج رہے تھے۔

''اقبال کی تقریر کے دوران بار بار چیئرز ہوتے رہے۔ حضرت علامہ کی تقریر لمبی تھی۔ انگریزی میں تھی افسوس کہ میں اس کے سارے حصے تفصیل کے ساتھ یہاں درج نہ کرسکا۔ اسلئے کہ ڈاک کا وقت بالکل قریب ہے۔

مسٹر عبداللہ یوسف علی اور سروجنی نائیڈو

علامہ اقبال جب تقریر کر چکے تو شیخ نور محمد صاحب نے ایک تقریر میں اقبال کی شاعری کے بعض پہلو واضح کئے۔ پھر مسٹر عبداللہ یوسف علی نے ایک نہایت عمدہ اور موزوں تقریر کی۔ عبداللہ یوسف علی نے ''بانگ درا'' میں سے ''کل ایک خواب گاہِ نبی پہ رو رو کے کہہ رہا تھا'' والی

نظم پڑھی اور اس کی تشریح کے ضمن میں حضرت علامہ کے اچھوتے اسلوب بیان کے متعلق بعض نکات واضح کیے۔ پھر فرمایا کہ ۴ رنومبر کو میں نے حضرت علامہ کو فرانس کے ایک ڈراما نگار اور شاعر سے تشبیہ دی تھی۔ آج میں ایک جرمن مصنف کا نام پیش کرتا ہوں جو اس اعتبار سے کہ ڈاکٹر اقبال سے بہت مشابہت رکھتا ہے کہ وہ جرمنی میں یاس و ناامیدی کے دور میں پیدا ہوا اور اس نے اپنی تحریرات کے ذریعہ سے قوم کی ہمت بڑھائی یعنی نٹشے۔ مسٹر عبداللہ یوسف علی نے آخر میں کہا کہ ''اقبال لٹریری ایسوسی ایشن'' کے ذریعہ ہم سب اقبال کے خیالات کو یہاں کی دنیا تک پہنچا سکتے ہیں اور اس ذریعہ سے ہندوستان اور یورپ کے مابین مفاہمت کی نہایت عمدہ فضا پیدا کر سکتے ہیں۔

اس تقریب کی ایک اور اہم بات یہ تھی کہ حاضرین نے متفقہ طور پر اقبال کو ایشیا کا ملک الشعراء منتخب کیا۔ سب سے آخر میں اقبال کی دوست، قومی رہنما اور انگریزی کی مشہور شاعرہ مسز سروجنی نائیڈو نے ایک نہایت دلکش تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ میں اپنے مایہ ناز شاعر بھائی کے دوش بدوش کھڑی ہوئی جو کہ دنیا میں قیام امن کی زبردست شہادت ہے۔ گاندھی جی اور دیگر گول میز کانفرنس کے مندوبین نے بھی اقبال کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا۔ ہز ہائنس آغا خان نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا اقبال لٹریری اسوسی ایشن کی یہ انتہائی خوش قسمتی ہے کہ اس کے افتتاح کے موقع پر وہ شخصیت (اقبال) موجود ہے جس کے نام پر یہ اسوسی ایشن بنی۔[1]

[1]۔ بحوالہ رپورٹ از مولانا غلام رسول مہر، مطبوعہ روزنامہ خلافت، بمبئی شنبہ، ۲۸ رنومبر ۱۹۳۱ء، ص ۸

ہسپانیہ میں علامہ اقبال کے مشاہدات

(روزنامہ خلافت کو دیا گیا ایک یادگار انٹرویو)

بتاریخ ۲۵/فروری ۱۹۳۳ء

اقبال اردو اور فارسی کے عظیم المرتبت شاعر تھے۔ان کی شاعری میں فلسفہ وحکمت کے بے شمار پہلو پوشیدہ ہیں۔ شاعر اور فلسفی ہونے کے ساتھ اقبال علم و فضل کے لحاظ سے بیسویں صدی کی ایک عبقری شخصیت تھے جن کا فلسفیانہ ادراک انہیں ممتاز مغربی فلسفیوں کے ہمسر بنا دیتا ہے۔ وہ مشرق و مغرب کے فلسفیانہ افکار، ادب اور تاریخ کے بے مثال عالم تھے۔ اسلامی علوم پر ان کی گہری نظر تھی اور وہ ہندوستان اور بطور خاص ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل سے گہری وابستگی رکھتے تھے۔ ہندوستان ہی نہیں بلکہ عالمی سیاست میں مسلمان ایک نازک دور سے گزر رہے تھے اور مسلمانوں کی پر شکوہ تاریخ کے آئینے میں جب وہ ان کے حال پر غور کرتے تھے تو انہیں مایوسی ہوتی تھی۔ اقبال نے ہندوستانی سیاست سے ابتداء میں صرف نظریاتی اعتبار سے دلچسپی لی۔ اس دلچسپی کی واضح مثالیں ان کی شاعری میں موجود ہیں، لیکن اپنی زندگی کے آخری ایام میں مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے انہوں نے عملاً بھی مسلمانوں کی سیاست میں دلچسپی لی۔ وہ پہلے ہندوستانی مسلمانوں کے ڈیلی گیشن کے صدر نامزد ہوئے، انھوں نے پنجاب لیجسلیٹو کاونسل کے ممبر بھی منتخب ہوئے اور جب ۱۹۳۱ء

میں لندن میں دوسری گول میز کانفرنس منعقد ہوئی تو اس یادگار کانفرنس میں بھی ہندوستانی مسلم وفد کے نمائندہ کی حیثیت سے اس میں شریک ہوئے۔ پنجاب سے شائع ہونے والے روزنامہ انقلاب کے مدیر، مشہور عالم اور محقق اور اقبال کے دیرینہ رفیق لندن میں اقبال کے ساتھ تھے۔ اور کانفرنس کی کارروائیوں سے روزنانہ انقلاب (لاہور) کے علاوہ روزنامہ خلافت (بمبئی) کو واقف کراتے تھے۔ اسی موقع پر واپسی میں یروشلم میں منعقدہ عالمی مسلم کانگریس میں بھی شرکت فرمائی۔

۱۹۳۲ء کے اواخر میں لندن میں تیسری گول میز کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس موقع پر وہ گاندھی جی کی دوست مس فارکھرسن سے بھی ملے جو ہندوستان کی آزادی کی اور اسی طرح مشرق وسطیٰ یا عرب دنیا کے مخدوش حالات کی موئید اور فعال ممبر تھیں۔ اسی موقع پر وہ پیرس بھی گئے اور مشہور فلسفی برگساں سے ملاقات کی جس کے فلسفے سے وہ ابتداء میں بہت متاثر تھے۔ فرانس کے بعد وہ اسپین گئے جہاں تقریباً سات سو سال مسلمانوں نے بڑے شان سے حکومت کی تھی اور دنیائے علم و ادب، سائنس اور حکمت اور صنعت و تعمیر کی دنیا میں انقلابی کارنامے انجام دیئے تھے۔ اسپین کے شہر قرطبہ (Cardova) کی عالمی سطح پر اپنی اعلیٰ شناخت تھی۔ اقبال نے اس مسجد میں جو فلسفۂ زمان و مکان کا استعارہ ہے صدیوں بعد نماز ادا کی۔ اقبال کی مشہور اور شہکار نظم ''مسجد قرطبہ'' اس سفر کی یادگار ہے۔ اسپین میں انہیں میڈرڈ یونیورسٹی میں اسلامی اسکالر ایسن پیلاسیو (Asin Palacios) نے تقریر کی دعوت دی۔ ایسن پیلاسیو نے اسلام پر تحقیقات کے علاوہ دانتے کی ڈوائن کامیڈی (Devine Comedy by Dante) پر اسلامی اثرات کی بازیافت بھی کی تھی۔ [1]

علامہ اقبال اسپین کے اس سفر سے جب ہندوستان لوٹے تو ان کا قیام بمبئی میں حسب دستور خلافت ہاؤس میں رہا۔ روزنامہ خلافت (بمبئی) یہاں کا مقبول روزنامہ تھا۔ اقبال کی بمبئی آمد اور خلافت ہاؤس میں ان کے قیام سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، خلافت کے نامہ نگار نے اقبال سے سفر اسپین سے متعلق سوالات کئے تھے۔ ان سوالات کے جواب میں اقبال نے

۱۔ 1- Annewaria Schimmel : Gabriel's Wing - Leiden E.J.Brill (1963) P. 53

ایک مختصر تقریر کی، جس کا اختصار درج ذیل ہے:

''مجھے لندن میں اسپین جا کر لیکچر دینے کی دعوت ملی تھی۔ مجھے اسلام کے اس مرکز کو دیکھنے کا پہلے سے شوق تھا اسلئے میں نے دعوت قبول کر لی۔ مجھے وہاں پہنچنے سے پہلے موضوع تقریر کا کوئی علم نہ تھا، البتہ خواہش یہ تھی کہ کہ ایسا مضمون ملے جس پر تقریر کرتے ہوئے میں اسلامک کلچر و تمدن اور اسلامی فلسفہ پر کچھ کہہ سکوں۔ وہاں پہنچ کر پروفیسر آسن کو میں نے انتخاب مضمون کا اختیار دے دیا۔ اتفاق سے انھوں نے وہی مضمون تجویز کیا، جس کا میں خود خواہش مند تھا۔ یعنی ''اسپین اور فلسفہ اسلام'' میرا لیکچر میڈرڈ کی جدید یونیورسٹی میں ایک گھنٹے تک جاری رہا جس میں میں نے اسپین کے مسلمانوں کا تمدن، فلسفہ اور ان کی تہذیب و روحانیت کے مختلف پہلوؤں کی تشریح و تفسیر بیان کرتے ہوئے حاضرین سے اپیل کی کہ سنی سنائی باتوں پر یقین نہ کریں۔ نہ عیسائیوں کے غلط پروپیگنڈے سے متاثر ہوں بلکہ عربوں کی تاریخ کا خود مطالعہ کریں۔

میں نے موقع کو غنیمت سمجھ کر ملک کے متعدد مشہور تاریخی مقامات و آثار کا بنظرِ غور مطالعہ کیا۔ میں اپنے تاثرات کا اظہار الفاظ میں نہیں کر سکتا۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ جس طرح یہودیوں کے لئے ''ارض موعودہ'' فلسطین ہے اسی طرح عربوں کے لئے ''اسپین'' کی سرزمین ''موعودہ'' تھی۔ اس قدر خوبصورت، اس درجہ پر فضا اور ایسا آرام دہ ملک!

پروفیسر آسن عربی زبان کے پروفیسر اور بہت ہی خوش خلق و ملنسار آدمی ہیں ان کا ایک شاگرد قرطبہ کی قدیم یونیورسٹی کا پرنسپل ہے۔ اس یونیورسٹی میں عربی تعلیم پر بہت زور دیا جارہا ہے۔

اسلام کی دلچسپی

ایک سوال کے جواب میں علامہ نے فرمایا کہ ''اس وقت تو وہاں کوئی مسلمان نہیں ہے لیکن تعلیم یافتہ طبقہ اب عربی النسل ہونے پر فخر کا اظہار کرنے لگا ہے اور ہر اچھی چیز کو ''مورش'' کہہ دیتا ہے۔ (یعنی اسلامی) ان میں اسلام کی طرف بغض و عناد کم ہوتا جارہا ہے۔ اور وہ

اسلامی تہذیب وتمدن اور فلسفۂ مذہب کا مطالعہ بڑے شوق سے (کرتے ہیں[1])۔ اسپین میں اکثریت رومن کیتھولک کی ہے لیکن یہ مذہب روز بروز کم ہوتا جارہا ہے۔ گرجے آباد تو ہیں مگران میں غریب طبقہ جاتا ہے۔ یہ حالت تقریباً ہر یورپین ملک کی ہے۔

معابد و مساجد

عربوں کے زمانے کی عمارتوں کے متعلق جب سوال کیا گیا تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ ''جن مسجدوں کو گرجا میں تبدیل کر دیا گیا تھا وہ اب تک مسجدوں کی شکل میں نہیں آئیں۔ البتہ چند مسجدیں واگذاشت ہوگئی ہیں اور باقی کے متعلق امید ہے کہ تعصب اور عناد کی کمی ہونے پر واگذاشت ہو جائیں گی۔

محکمۂ آثار قدیم نے عربوں کی عمارتیں کئی جگہ کھدوا کے نکالی ہیں۔ کارڈوا میں کھدائی کا کام جاری ہے۔ خلفاء کے زمانے کی چند عمارتیں نکل آئی ہیں۔ ان کے بعض حصوں میں ٹوٹی پھوٹی تصویریں بھی نظر آتی ہیں۔

عربوں کا تمدن ہنوز زندہ ہے۔

ایک سوال کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ ''عربوں کا تمدن اسپین سے بالکل فنا نہیں ہوا ہے۔ چنانچہ شہر طلیطہ عربی تمدن کی زندہ مثال ہے۔ قدرتی مناظر وحسن کے علاوہ یہاں کی معاشرت بھی آرام دہ اور دلکش ہے۔ وہاں پہنچ کر تو میں نے محسوس ہی نہیں کیا کہ اجنبی ملک میں ہوں۔ یہاں کے بازار، مکانات بالکل مشرقی نمونہ کے ہیں اور غذا بھی وہی ہے جو ہم لوگوں کو مرغوب ہے۔ چنانچہ پلاؤ کا مجھے وہی مزہ آیا جو لاہور میں آتا ہے۔ لوگ خلیق اور ملنسار ہیں۔ ان کے رہنے سہنے کا طریقہ بھی مشرقی ہے۔

یہاں ایک چھوٹی سی بالکل سادہ وضع کی مسجد ہے جو اپنی ابتدائی حالت میں اب تک قائم ہے۔ غالباً کسی مسلمان سپاہی نے فتح طلیطہ کے بعد اسے بنوایا تھا۔ موجودہ حکومت نے اسے آثارِ قدیمہ میں لے کر محفوظ کر دیا ہے۔

اسپین کی زبان میں اب تک عربی الفاظ بہت زیادہ استعمال ہوتے ہیں۔ ''ال'' تو

[1]۔ بریکٹ کے الفاظ متن میں شامل نہیں ہیں اور یہ میرا اضافہ ہے۔

اکثر الفاظ میں ملا ہوتا ہے۔"

عربوں کے احسانات

موجودہ حکومت کے متعلق سوال ہوا تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ "جمہوریت سے تمام لوگ خوش ہیں معدودے چند ہوں گے جو شہنشاہیت پسند ہوں۔"

موجودہ حکومت کوشش کر رہی ہے کہ قدرتی انعام واکرام سے استفادہ کریں چنانچہ کان کنی او معدنیات کی طرف توجہ دی جا رہی ہے، لیکن واضح رہے کہ معدنیات کے متعلق اب تک جو معلومات بہم ہو سکی ہیں وہ سب وہی ہیں جن کی تحقیقات عربوں نے کی تھیں۔ ان کی کاوشوں کا نفع موجودہ نسل اٹھانا چاہتی ہے۔

اسکوریل کی لائبریری بڑی عظیم الشان لائبریری ہے۔ افسوس یہ ہے کہ عربوں کے زمانے کی قلمی تحریروں کا ذخیرہ متعصبین نے پہلے ہی غارت کر دیا تھا۔ اب تھوڑا ذخیرہ رہ گیا ہے جن میں زیادہ تر مولانا جامی اور حضرت حافظ کی تحریریں ہیں۔

مشورہ

ڈاکٹر صاحب نے آخر میں یہ مشورہ دیا کہ "ضرورت ہے کہ یہاں سے دو چار ایسے تعلیم یافتہ طلباء اسپین بھیجے جائیں جو فلسفہ الٰہیات، عربی تمدن، اسلامی تاریخ اور مذہب سے اچھی طرح واقف ہوں، تاکہ وہ اسلام کا صحیح نمونہ اہلِ ہسپانیہ میں پیش کر سکیں۔[1]

[1] روزنامہ خلافت، بمبئی، شنبہ ۲۵ فروری، ۱۹۳۳ء، ص ۷

تیسری گول میز کانفرنس، لکھنؤ مسلم کانفرنس اور اقبال

ہندوستان کی آزادی کے لئے دو سیاسی جماعتیں تحریک چلاتی رہیں، اولاً انڈین نیشنل کانگریس، جس میں ہندو مسلمان دونوں شامل تھے۔ جسٹس بدرالدین طیب جی کانگریس کے تیسرے صدر تھے۔ بعد میں مولانا آزاد اس کے ایک ممتاز صدر بنے۔ پھر بھی کچھ سیاسی اختلافات کی وجہ سے آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی تاکہ ہندوستانی مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ ہو۔ کانگریس اور مسلم لیگ کی اس سیاست میں انگریز حکومت نے ۱۹۱۹ء کا قانون پاس کیا۔ جو ہندوستانیوں کے حق میں نہیں تھا۔ ہندوستانی رہنما پوری طرح ذمہ دار حکومت چاہتے تھے۔ اس کے جواب میں راولٹ ایکٹ پاس کیا گیا۔ ۱۹۱۹ء کے اسی ایکٹ کا اثر تھا جس کی وجہ سے جلیانوالہ باغ کا حادثہ ہوا جو انگریزوں کے ظلم و بربریت کا نمونہ تھا۔ اس کے بعد نہرو رپورٹ پیش کی گئی جس کی مسلم لیگ نے مخالفت کی اور قائدِ اعظم جناح نے اپنا چودہ نکاتی پروگرام پیش کیا جس میں مسلمانوں کے متعدد حقوق کی حفاظت کے نکات تھے۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے اختلافات کی روشنی میں اور اقلیتوں (مسلمانوں) کی مانگوں کے جواب میں

وزیر اعظم برطانیہ میک ڈونالڈ نے اپنا مشہور Communal Award پیش کیا جو جداگانہ رائے دہندگی کے حق میں تھا، جو مسلمانوں، یورپینوں اور سکھوں کو مدنظر رکھ کر پیش کیا گیا تھا۔ باقی دیگر فرقوں کے لئے عام رائے دہندگی General Electorate کی تجویز تھی۔ فرقہ وارانہ ایوارڈ کے خلاف مہاتما گاندھی اور دیگر قائدین نے یہ کہتے ہوئے احتجاج اور مخالفت کی کہ اس سے ہندوستان کی قومی یکجہتی کو نقصان پہنچے گا۔ تاہم مسلم لیگی قائدین نے اسے پسند کیا۔ اس لئے کہ اس تجویز میں مسلمانوں کے لئے مراعات حاصل تھیں۔ اقبال نے جداگانہ انتخاب Separate Electorate کے حوالے سے روزنامہ خلافت کو جو انٹرویو دیا تھا وہ یہاں پیش کیا جارہا ہے۔ اس سے اقبال کی مسلمانوں کے تعلق سے سیاسی فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔[1]

۱۹۳۲ء میں اقبال ''آل انڈیا مسلم کانفرنس'' کے صدر تھے۔ اسی زمانے میں ہندوستان کے سیاسی ماحول میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں سیاسی مصالحت پیدا کرنے کے مقصد کے تحت ''لکھنؤ مسلم کانفرنس'' کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس کانفرنس میں اقبال اور ان کے دیگر رفقاء مثلاً مولانا شفیع داؤدی اور مولانا غلام رسول مہر شریک نہیں ہوئے۔ اگرچہ دیگر مسلم رہنماؤں نے کانفرنس کو بڑی اہمیت دی، اقبال اور مذکورہ رفقاء اس کانفرنس کے مخالف تھے۔ مولانا شوکت علی کو اس مخالفت کا افسوس تھا، چنانچہ انھوں نے روزنامہ خلافت (بمبئی) کے ۱۲/اکتوبر ۱۹۳۲ء کے شمارے میں اپنے ایڈیٹوریل میں بھی اقبال، مولانا شفیع داؤدی اور غلام رسول مہر کی کانفرنس میں عدم شرکت کے تعلق سے اظہارِ افسوس کیا ہے۔ مہاتما گاندھی کی عدم موجودگی بھی، مایوس کن تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس میں شریک تھے۔ انھوں نے کلکتہ سے ۱۹/اکتوبر ۱۹۳۲ء کو خصوصی تار بھیجا جس میں لکھا تھا:

> ''مسلم کانفرنس میں بالاتفاق رائے طے ہوگیا ہے کہ اگر مسلمانوں کے مطالبات کو منظور کرلیا جائے تو وہ جداگانہ انتخاب پر زور نہ دیں گے۔

---

[1]۔ تفصیلات کے لئے دیکھئے:
Legar and constituational History of India (Vol II) by : M. Rama Jois, N. M. Tripathi Pvt. Ltd., Bombay 1984 (Ch. 4) Pages 288-299

موجودہ صورت حال میں اس سے بہتر حل ناممکن ہے۔ آپ کی عدم موجودگی کامیابی میں حارج ہے۔ اپنے پیام سے سرفراز کیجئے۔ ہم کو اعتماد ہے کہ حکومت اس میں رکاوٹ نہ پیدا کرے گی۔''[1]

اس کانفرنس کی مکمل کارروائی روزنامہ خلافت میں شائع ہوئی جس کا ذکر بعد میں کیا جائے گا، مگر اس کانفرنس میں اقبال کی عدم شرکت کی وجوہات جو انھوں نے بیان کیں وہ درج ذیل ہیں:

۱۱/ اکتوبر کو لاہور میں اقبال نے ٹائمز آف انڈیا کے نامہ نگار کو بیان دیتے ہوئے کہا:

اگر یہ خیال کیا گیا کہ گاندھی جی کی رہائی کے بغیر ممکن نہیں کہ ہندو کوئی بھی تجویز مسلمانوں کی بحث و تمحیص کے لئے پیش کر سکیں تو پھر انہیں وائسرائے سے ان کی رہائی کے لئے درخواست کرنا چاہئے۔ میں ذاتی طور پر ان کی رہائی کو خوش آمدید کہوں گا۔

آج مجھے صاحبزادہ عبدالقیوم خان کا ایک تار موصول ہوا ہے کہ وہ لکھنؤ کی مجوزہ کانفرنس میں شرکت نہ کریں گے کیونکہ ان بنیادوں پر اس کو غیر ضروری سمجھتے ہیں جن کو میں بیان کر چکا ہوں۔ مسٹر غلام محی الدین، مسٹر غلام رسول مہرؔ اور مولانا ظفر علی خاں اور میں سب اس کانفرنس میں مدعو کئے گئے تھے، لیکن ہم میں سے کوئی بھی اس میں شریک نہ ہوگا۔

مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ بہار اور بنگال کے مسلمانوں نے بھی ایسا ہی اعلان کیا ہے اور سر محمد یعقوب اور ڈاکٹر شفاعت احمد خان نے بھی شرکت سے انکار کر دیا ہے، ان حالات میں کانفرنس کے محرکین سے درخواست کرتا ہوں کہ اس وقت تک انتظار کریں کہ ہندو اکثریت ہمارے سامنے خاص تجویز پیش کرے۔

اس وقت ہمارے پاس خاص چیز بحث کے لئے نہیں ہے بلکہ اس وقت بھی وہی امور ہیں جس پر دس سال سے بحث ہو رہی ہے اور جس کی بابت ہمارے ریزولیشن قائم ہیں۔ ہم مسلمانوں کے لئے مسئلہ انتخاب اور تحفظات کا ہے جس پر بہت بحث کر چکے ہیں۔ ان بحثوں میں بہت مخالفت ہو چکی ہے اور اس کی اچھی چھان بین ہو چکی ہے۔ اسلئے مزید بحث سے کچھ

---

[1] روزنامہ خلافت (بمبئی) ۲۱/ اکتوبر ۱۹۳۲ء، ص ۷

فائدہ نہیں ہوگا۔

شاید مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر سید محمود انہیں دلائل کا اعادہ کریں گے جو انھوں نے اس سے پہلے پیش کئے تھے اور اس کا جواب مختلف الخیال مسلمانوں کی طرف سے دیا جائے گا اور اس طرح کانفرنس میں الفاظ کا تماشہ ہوگا اور ان دلائل سے کوئی مفید نتیجہ نہ نکلے گا۔ جیسا کہ میرا خیال ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر محمود اور آل انڈیا مسلم کانفرنس اور آل انڈیا مسلم لیگ کے مابین صرف ایک اختلاف ہے اور وہ مسئلہ انتخاب ہے۔ مسلمانوں کو دونوں جماعتیں کے مابین ریز رولیشن میں جداگانہ انتخاب پر زور دیا گیا ہے۔

مسلمانوں میں اتحاد و یکجہتی پیدا کرنا اس کانفرنس کا مقصد تھا۔

لکھنؤ مسلم کانفرنس جو اکتوبر ۱۹۳۲ء میں منعقد ہوئی، اس کا اولین مقصد مسلمانوں کا باہمی اتحاد ہے اور اس میں جو افراد اور جماعتیں شریک ہوئیں انہیں مسلمانانِ ہند کی غالب اکثریت کی نمائندگی کا حق حاصل تھا۔ وہ تمام مقتدر اسلامی مجالس اور اس کے ذمہ دار ارکان کی شرکت کے علاوہ مدراس، بمبئی، صوبہ متحدہ، بہار اور دیگر صوبوں کے نمائندوں کی بڑی تعداد نے اس کانفرنس میں شرکت کی۔

اس کانفرنس میں جمعیۃ احرار ہند اور مسلم انڈپنڈینٹ پارٹی نے بھی کانفرنس کے اغراض و مقاصد سے دلی ہمدردی کا اظہار کیا۔ آخر الذکر جماعت کے لیڈر مولانا حسرت موہانی نے اس کانفرنس میں شرکت فرمائی۔ مولانا ظفر علی خان نے بھی غلط فہمی دور کرنے کا اعلان کیا اور اس کانفرنس کی حمایت کی۔

ہندو مسلم مفاہمت اس کانفرنس کا اہم مقصد تھا۔ وہ لوگ جو اس کانفرنس میں شریک نہیں ہوئے ان کا خیال تھا کہ حالات کے پیش نظر ہندو مسلم مفاہمت کیلئے تجاویز کی پیش کش ہندوؤں کی جانب سے ہونی چاہئے تھی۔ تاہم اس بات پر اتفاق تھا کہ مسلمانانِ ہند میں باہم اتفاق پیدا ہو اور اس کے بعد ہندو بھائیوں کو مسلمانوں کے مطالبات تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہ ہوگا۔

اس کانفرنس کی کارروائی جو اخبارِ خلافت میں شائع ہوئی۔ درج ذیل ہے۔

''دو دن کی مسلسل اور انتھک کوششوں کے بعد آخر کار مسلمان قائدین نے جو یہاں جمع ہوئے تھے ایک ایسی راہ نکالی جس پر سب متفق ہو گئے اور آج اتوار کے دن ٹھیک پانچ بجے سلیم پور ہاؤس کے شاندار ہال میں مسلمانوں کے باہمی اتحاد کا اعلان ہو گیا۔ اور متفقہ تجویز منظور ہو گئی۔ مسلمانوں کے تیرہ مطالبات پر سب متحدہ ہو گئے اور سب نے بیک آواز کہہ دیا کہ جداگانہ انتخاب مسلمانوں کے مفاد کے لئے سخت مضر ہے اور اگر ان کے تیرہ مطالبات منظور ہو جائیں تو وہ مخلوط انتخاب کو بخوشی قبول کر لیں گے۔ کانفرنس نے پنڈت مدن موہن مالویہ کی دعوت مسلمان قائدین ہندو مسلم تصفیہ کے لئے ہندو لیڈروں سے اگر گفتگو کریں بخوشی منظور کر لی گئی۔ توقع ہے کہ لاہور اور لائل پور میں مالویہ جی کی ہندو سکھ لیڈروں سے گفتگو کے بعد ہندو مسلم اور سکھ رہنماؤں میں کبھی عنقریب مشاورت ہو سکے گی اور ہندوستان میں قومی اتحاد کا سنگ بنیاد رکھ دیا جائیگا۔

کانفرنس کی تفصیلات:

کانفرنس کا سب سے پہلا دن نہایت خوشگوار تھا۔ باوجود علامہ اقبال اور مولانا شفیع داؤدی کی مخالفت کے مسلم کانفرنس کے نہ صرف سربر آوردہ ارباب اور سابق عہدیدار بلکہ اس کے متعدد اراکین بھی چلے آرہے ہیں اور قوی توقع تھی کہ کانفرنس کامیاب ہوگی۔

پہلے دن کی کاروائی

مسلمان رہنماؤں کی مصالحتی کانفرنس کا سب سے پہلا اجلاس ہفتہ کے دن چار بجے راجہ صاحب سلیم پور کی صدارت میں سلیم پور ہاؤس میں ہوا، سب سے پہلے صاحبِ صدر نے مولانا ابوالکلام آزاد صاحب اور مولانا شوکت علی نے اجتماع کے مقاصد اور مسلمانوں میں کامل اتفاق پر زور دیا اور مولانا ظفر علی خاں نے بھی ایک پرزور تقریر کی۔ مولانا آزاد اور مولانا شوکت علی کی تقریروں نے کانفرنس کی کامیابی کا پورا یقین دلایا۔ قوم پرور جماعت کے قائد مولانا آزاد نے صاف صاف بتلایا کہ اگر مسلم کانفرنس والے اور حامیاں جداگانہ انتخاب چاہتے ہیں کہ ہندوان کے تیرہ مطالبات کو منظور کریں تو انہیں اس کی کوشش کرنی چاہئے کہ باہمی اتحاد سے فرقہ وارانہ مسئلہ کا تصفیہ کیا جائے۔ مولانا نے مخلوط انتخاب پر زور دیا اور کہا کہ

مسلمانوں کا مفاد اس میں ہے کہ اب وہ زیادہ اختلاف نہ کریں اور اسے قبول کریں۔ دونوں بزرگوں کی تقریروں کا بہت ہی اچھا اثر ہوا۔

کون لوگ شریک تھے:

شرکاء میں مسلمانوں کی سب اسلامی جماعتوں کے نمائندے شریک ہوئے جن میں نمایاں شخصیتیں مولانا شوکت علی، شیخ عبدالمجید سندھی، سردار سلیمان قاسم مٹھا، مولانا عرفان، میاں جعفر شاہ اور میاں احمد شاہ، مشیر یوسفی، حافظ محمد عثمان، میاں فیروز الدین احمد وغیرہ۔ جمعیۃ خلافت کے اراکین مولانا ابوالکلام آزاد، چودھری خلیق الزماں، ڈاکٹر سید محمود، مسٹر رفیع احمد قدوائی، ڈاکٹر محمود اللہ جنگ وغیرہ۔ قوم اور جماعت کے اراکین، مولانا سجاد صاحب، مفتی محمد نعیم صاحب اور مولانا عبدالحنان صاحب، مولانا حفظ الرحمن صاحب، حاجی عبداللہ ہارون نے بھی کانفرنس کے بے ضابطہ مشورے میں شرکت کی۔

اختلافی آواز

معلوم ہوا کہ ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب اور سیٹھ عبداللہ ہارون نے مسلم کانفرنس کے بعض اراکین کی عدم شرکت کا بھی ذکر کیا۔ لیکن انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ ہمیں اب ایک مرکز پر آ جانا چاہئے۔ یہ دونوں حضرات کانفرنس کے انعقاد کی مخالفت کرتے رہے، لیکن شرکائے کانفرنس پر اس کا اثر نہیں ہوا۔ مولانا شوکت علی کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ انھوں نے علامہ اقبال اور مولانا شفیع داؤدی کے انکار پر اظہارِ افسوس کیا اور یہ فرمایا کہ مصالحت کی کوشش، علیٰحدگی کی ذمہ داری انہیں لوگوں پر جو کانفرنس میں نہیں آئے، کیونکہ دعوت نامے سب لوگوں کو یکساں بھیجے گئے۔

جب اخبارات میں لکھنؤ مسلم کانفرنس کی رپورٹیں شائع ہوئیں جس میں متفقہ طور پر فیصلے کئے گئے تھے ان کا مطالعہ کرنے کے بعد اقبال کے خیالات میں ایک انقلابی تبدیلی آئی۔ انھوں نے لکھنؤ کانفرنس کے سلسلے میں لاہور سے ۱۷/اکتوبر ۱۹۳۲ء کو پریس میں اشاعت کے لئے ذیل کا بیان جاری کرتے ہوئے کانفرنس کی حمایت کی اور کانفرنس کی آواز پر صدائے لبیک کہی۔

علامہ اقبال کا لکھنؤ کانفرنس کی حمایت میں،
کانفرنس کی آواز پر صدائے لبیک

لاہور، ۱۷/اکتوبر۔ علامہ سر اقبال نے لکھنؤ کانفرنس کے سلسلے میں آج ذیل کا بیان پریس کو اشاعت کے لئے ارسال فرمایا ہے۔

لکھنؤ کانفرنس کی قرارداد کا مطالعہ کرنے کے بعد میں محسوس کرتا ہوں کہ اس قرار میں ضرور خدا کی رحمت پوشیدہ ہے، فرقہ وارانہ ایوارڈ کی گفت وشنید کے سلسلے میں جو مطالبہ میں نے کیا تھا باہمی سمجھوتے کے لئے پہلے ہندوستان کی اکثریت والے طبقے (ہندوؤں) کو کوئی کھلی تجویز پیش کرنا چاہئے اس قرارداد کا اعادہ کیا گیا ہے۔

متذکرہ بالا قرارداد کا صاف مطلب یہ ہے کہ جب تک ہندو، مسلمانوں کے باقی ۱۳ مطالبات تسلیم نہ کریں گے مسلم نیابت کا مسئلہ حل نہ ہوگا۔ اس لئے باہمی اتحاد اور مفاہمت کا فیصلہ صرف ان پر منحصر ہے۔

میں خیال کرتا ہوں کہ جہاں تک اسلامی طبقے کے عام خیالات کا تعلق ہے مسلم نیشنلسٹ بھائی پہلے کی نسبت مسلمانوں کی .... اکثر جماعت کے قریب تر اور نیابت کے مسئلے میں مسلم طبقے کے فیصلے سے متحد ہو گئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ کی قراردادوں کا پہلے بھی یہی مطلب تھا۔ لیکن اگر نیشنلسٹ مسلم اب دوبارہ کسی فیصلے کی ضرورت محسوس کریں گے تو ان کی خواہش کو بسر وچشم پورا کیا جائے گا۔

(روزنامہ خلافت ۲۲/اکتوبر، ۱۹۳۲ء، ص ۳)

علامہ سر محمد اقبال اکثریت کے ساتھ ہو جائیں گے۔
لکھنؤ کانفرنس نے آپ کا نقطۂ خیال لے لیا۔
نامہ نگار خلافت سے ڈاکٹر صاحب کی گفتگو

بمبئی ۔ ۱۹/اکتوبر، ڈاکٹر سر محمد اقبال اپنے گذشتہ پروگرام کے مطابق ۱۹/اکتوبر ۱۹۳۲ء کو ۳۰-۸ بجے صبح فرنٹیئر میل سے بمبئی تشریف لائے۔ اسٹیشن پر جناب علامہ سلجوقی

صاحب قونصل سلطنت افغانستان، ڈاکٹر صاحب کو لینے کے لئے تشریف فرما تھے۔ڈاکٹر صاحب نے بمبئی کے دیگر احباب کو وقت آمد کی کوئی اطلاع نہیں دی تھی اس لئے سوائے سفیر صاحب کے اور کوئی اسٹیشن پر نہ تھا۔ڈاکٹر صاحب سیدھے سفارتخانہ افغانستان تشریف لے گئے۔اور جناب سفیر صاحب کے مہمان ہیں چونکہ مولانا محمد عرفان صاحب کو آپ کی آمد کی اطلاع پہلے سے تھی اس لئے وہ لکھنؤ سے آج صبح بمبئی آ گئے اور ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ساتھ ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کل ۲۰/ اکتوبر یوم پنجشنبہ کو ۴/ بجے شام کے جہاز سے ولایت روانہ ہو جائیں گے۔

نامہ نگار خلافت نے ڈاکٹر صاحب کے خیالات معلوم کرنے کی صبح ہی سے کوشش شروع کر دی تھی مگر ۶/ بجے شام سے پہلے اس کو کامیابی نہ ہو سکی۔۶/ بجے شام کو آپ جناب آنریبل سردار سلیمان قاسم مٹھا صاحب کے دولت کدہ پر چائے پر مدعو تھے۔نامہ نگار نے معزز مہمان اور محترم میزبان کی اجازت لے کر علامہ موصوف سے باقاعدہ انٹرویو لیا جو حسب ذیل ہے۔

نامہ نگار خلافت نے ڈاکٹر اقبال سے انٹرویو لیا تو آپ نے حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا:

لکھنؤ کانفرنس کے متعلق آپ نے فرمایا کہ میری خواہش یہ تھی کہ اس کو تیسری گول میز کانفرنس کے بعد منعقد کیا جاتا۔مولانا شوکت علی کی طرح میں بھی یونائیٹڈ انڈیا کا خواہش مند اور طلبگار ہوں فرق یہ ہے کہ جس مدت میں مولانا نے حاصل کرنا چاہا ہے اس کو میں قلیل کے لفظ سے تعبیر کرتا ہوں۔ہاں اگر نیشنلسٹ مسلمان ہمارے ۱۴ مطالبات کلیتہً تسلیم کر لیں تو آج یونائیٹڈ انڈیا کا منظر ہمارے سامنے آ سکتا ہے۔

س : سوال ہوا کہ اس یونائیٹڈ انڈیا کے حصول کا پہلا زینہ تو بین الاقوامی اتحاد ہے۔آپ اسے پہلے حاصل کر لینے کا کیا طریقہ تجویز فرمائیں گے؟

ج : ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ بین الاقوامی اتحاد ہونا بہت ضروری ہے لیکن یہ خیال کرتا

ہوں کہ جداگانہ انتخاب کی وجہ سے بین الاقوامی اتحاد نہیں ہوسکتا غلط تخیل ہے۔ اتحاد جداگانہ حالت میں بھی ہوسکتا ہے۔ سب سے زیادہ بڑی چیز جو اقوام ہند کو متحد کرسکتی ہے وہ اقتصادیات کا مسئلہ ہے۔

پنجاب کونسل کا تجربہ بتاتا ہے کہ اکثر معاملات میں ہندو مسلم متحد رہے ہیں۔ صرف ایک قانون کی تشکیل میں اختلاف ہوا۔ اور اسکا تعلق مہاجنوں سے تھا یا دوسری چیز مابہ النزاع سرکاری ملازمتیں ہوا کرتی ہیں۔ اس لئے سرمایہ داری یا ملازمتوں کے علاوہ بین الاقوامی اتحاد ممکن ہے اور اس کیلئے مخلوط انتخاب ہونا لازمی نہیں۔

س : کیا آپ گفتگوئے مصالحت یا سعی مفاہمت کی مخالفت کریں گے؟

ج : آپ نے زور دے کر فرمایا کہ ہرگز نہیں۔ میرا کہنا تو صرف اتنا ہے کہ پیغام صلح اکثریت کی طرف سے آنا چاہئے تھا لکھنؤ کانفرنس نے جو تجویز پاس کی ہے اس میں میرے خیال کا پرتو زیادہ مضمر ہے۔

س : اگر غیر مسلم اکثریت ۱۴ مطالبات من وعن منظور کر لے اور مشروط مخلوط انتخاب پر راضی ہو تو آپ کی کیا رائے ہے۔

ج : ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ انتخاب جداگانہ اس وقت مسلمان چھوڑنا نہیں چاہتے۔ پنجاب کے مسلمان تو اسے ہرگز ترک نہیں کریں گے۔

س : نامہ نگار نے ادب سے سوال کیا کہ اب آپ داعیان کانفرنس کو کیا مشورہ دیتے ہیں۔

ج : ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ میں صلح کا حامی ہوں اور سعی مصالحت کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ اگر ہندوؤں کی طرف سے صلح کی خواہش کی جائے تو مصالحت ضرور ہونی چاہئے۔ لیکن شرائط صلح میں جداگانہ انتخاب سے دست برداری مناسب نہیں۔ ہندوؤں کا مقصد جہاں تک میں نے سمجھا ہے یہی ہے کہ مسلمان جداگانہ انتخاب ترک کردیں۔ اگر ہند وصدق دل سے صلح کا حامی ہے تو وہ یہ شرط کیوں لگائے میرا اندازہ ہے کہ مسلم اکثریت جداگانہ انتخاب ہی چاہتی ہے۔

س : نامہ نگار نے سوال کیا کہ مسلم اکثریت کا خیال تو بڑی کانفرنس میں معلوم ہو جائے گا اگر اس کانفرنس میں نمائندے جان گئے تو؟ اس وقت آپ کا طرزِ عمل کیا ہوگا؟

ج : ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ میرا اندازہ ہے کہ مسلم اکثریت مشروط انتخاب قبول نہیں کرے گی۔ جن کو اس اندازہ سے اختلاف ہو وہ اسے میری ذاتی رائے سمجھ لیں لیکن اگر ہندوستان کی تمام منظم جماعتوں نے بڑی کانفرنس میں مخلوط انتخاب کسی شکل میں قبول کر لیا تو میں بھی اکثریت کا فیصلہ مان لوں گا اور کوئی مخالفانہ قدم نہیں کروں گا۔

(روزنامہ خلافت، بمبئی، ۲۱/ اکتوبر ۱۹۳۲ء، ص ۷)

مولانا شوکت علی کا پیامِ تبریک ڈاکٹر اقبال کے نام

نامہ نگار نے ڈاکٹر محمد اقبال کو وہ تار دکھایا جو آج ہی شام کو دفتر میں آیا تھا اور دریافت کیا کہ وہ کون سا انٹرویو ہے جس نے مولانا شوکت علی ۔۔۔۔۔اور دیگر اصحاب کو مطمئن کر دیا تو آپ نے فرمایا کہ غالباً وہ انٹرویو ہوگا جو لاہور سے روانہ ہوتے وقت سول اینڈ ملٹری گزٹ کے نامہ نگار کو دیا تھا۔

جب راقم الحروف نے دریافت کیا کہ کیا موجودہ انٹرویو اور لاہور کے انٹرویو میں کوئی خاص فرق ہے تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ نہیں۔ تقریباً یہی لب لباب اس انٹرویو کا بھی ہے۔

مولانا شوکت علی کا تار یہ ہے

نئی دہلی۔ ۱۹/ اکتوبر۔ از زاہد علی

مولانا شوکت علی آج صبح دہلی واپس آ گئے تاکہ پنڈت مالویہ سے گفتگو کر لیں مولانا آج مہاجرین الور سے مل کر کل الور روانہ ہوں گے مولانا نے حسب ذیل تار ڈاکٹر اقبال کے نام روانہ کیا ہے۔

میں آپ کا وہ پیغام دیکھ کر جو آپ نے ہندوستان سے روانہ ہونے سے پہلے مسلمانانِ ہند کو دیا ہے پھولے نہیں سماتا۔ ہم کو آپ جیسے محبوب دوست، رفیق کار اور رہنمائے ملت سے جس کی اسلام دوستی و دیانت داری پر کوئی بھی شبہ نہیں کر سکتا۔ ایسے ہی خیال کی توقع تھی آپ

اپنے اس تھکے ہوئے بڑے بھائی کا شکریہ اور مبارکباد قبول کر لیجئے۔ آپ کے اس پیغام سے ہمارے دل بڑھ گئے اور اس سے ہم کو باعزت مصالحت کے کاموں میں بڑی امداد ملے گی۔ ہندوستان اس قسم کی مصالحت کیلئے بے چین و منتظر ہے۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں بمبئی میں نہ ہونے کی وجہ سے دارالخلافت میں آپ کی مہمان داری نہ کر سکا۔ شیخ عبدالمجید، میاں احمد شاہ، جعفر شاہ، محی الدین یوسفی، زاہد، عبدالحنان اور میں آپ کو خدا حافظ کہتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ یہ سفر آپ کو مبارک ہو۔ بسامت روی و باز آئی۔

(روزنامہ خلافت، بمبئی، ۲۱/ اکتوبر ۱۹۳۲ء، ص ۷)

لندن میں سر اقبال کا خیر مقدم

"اعتماد کرو تا کہ تم پر اعتماد کیا جائے"

لندن: ۲۴/ نومبر، نیشنل لیگ ایک خاص ادارہ ہے جس کے تعلقات اسلامی دنیا کے ساتھ بہت گہرے اور دوستانہ ہیں۔ آج اس نے ڈاکٹر سر محمد اقبال کا شاندار خیر مقدم کیا۔ اس موقع پر گول میز کانفرنس کے مندوبین کے علاوہ برطانیہ اور ہندوستان کے نامی گرامی ڈیلی گیٹ اور مولانا شوکت علی صاحب بھی موجود تھے۔ لیگ کی صدر مس مارگریٹ فرگوسن نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ سر محمد اقبال نے اس موقع پر ایک پھڑکتی ہوئی تقریر کے دوران میں ایک بڑی دلچسپ بات کہی۔ آپ نے گول میز کانفرنس کے حوالے سے فرمایا کہ "برطانیہ کو ہندوستان پر اعتماد کرنا چاہیے تا کہ ہندوستان برطانیہ پر اعتماد کر سکے۔"

(روزنامہ خلافت، بمبئی ۲۷/ نومبر ۱۹۳۲ء، ص ۵)

سر محمد اقبال کا عزم انگلستان

لاہور، ۱۸/ اکتوبر (خاص تار) سر محمد اقبال لاہور سے بمبئی روانہ ہو گئے تا کہ وہاں سے گول میز کانفرنس کی شرکت کے لئے انگلستان روانہ ہو جائیں گے۔ راستہ میں وہ یورپ کے چند ملکوں کو بھی جائیں گے۔ واپسی میں وہ اسلامی ممالک کو بھی جائیں گے۔

(روزنامہ خلافت، بمبئی، ۲۰/ اکتوبر، ۱۹۳۲ء)

گول میز کانفرنس کے مندوبین کا باہمی تعاون

برطانوی مندوبین سے ملاقاتیں

لندن۔ ۱۸ر نومبر، گول میز کانفرنس کے متعلق مندوبین میں آج کچھ زیادہ سرگرمی نظر نہیں آئی تھی۔ البتہ باہم دگروہ گفت وشنید کرتے رہے اور برطانوی ڈیلی گیشن کے ممتاز ارکان سے ملتے جلتے رہے۔ کل کے اجلاس میں خوش فہمی اور اعتماد کی فضا صاف ظاہر کرتی تھی کہ مقررہ معیاد کے اندر جملہ معاملات خاطر خواہ طور پر طے ہو جائیں گے۔

سر اکبر حیدری نے ۲۹ر دسمبر ۱۹۳۲ء کو واپسی کا سفر مشروط طور پر رجسٹرڈ کر لیا ہے۔
ڈاکٹر سر محمد اقبال نے بیان کیا ہے کہ علیٰحدگی سندھ کا تائیدی مراسلہ مع اس ریزرولیشن کے جو کہ حیدر آباد (سندھ) میں پاس ہوا۔ ۲۲ر نومبر ۱۹۳۲ء کو تمام ممبرانِ پارلیمنٹ کو روانہ کر دیا جائے گا۔

(روزنامہ خلافت، بمبئی، ۲۲ر نومبر ۱۹۳۲ء، ص ۵)

گول میز کانفرنس کا اجلاس ۱۶ر نومبر ۱۹۳۲ء سے شروع ہوا، جس میں وزیر اعظم مسٹر میکڈانل (صدر کانفرنس) وزیر ہند اور آغا خان نے تقریریں کیں۔

(روزنامہ خلافت، بمبئی، ۱۷ر نومبر ۱۹۳۲ء)

اقبال اور عطیہ بیگم فیضی

اقبال اردو کی شعری روایت کے بلند ترین اور روشن مینار ہیں۔ ان کی شاعری کے آغاز سے لے کر آخر وقت تک انھوں نے مختلف مکاتیبِ فکر، سماجی عوامل اور شخصیتوں سے استفادہ کیا۔ جن شخصیتوں نے انہیں متاثر کیا ان میں مشرقی علم و ادب کے ماہرین بھی ہیں اور مغربی فلسفہ اور ادب کے نباض بھی۔ انھوں نے اپنی شاعری اور فلسفہ میں جن بزرگوں سے اکتسابِ فکر و فن کیا ہے ان میں محی الدین ابن عربی، رومی، بیدل، غالب، حالی، شبلی، آرنلڈ، برگساں، نطشے اور ہیگل و مارکس کی شخصیتیں بہت اہم ہیں۔ مذکورہ شخصیتوں کا اثر اقبال کے فکر و فن پر گہرا پڑا، اگرچہ انھوں نے اپنی راہ خود تلاش کی اور اردو اور فارسی کے شعر و ادب کو نئے معنی و مفاہیم عطا کر کے شعر و ادب میں نئی جہتیں تلاش کیں تاہم ان کی شاعری میں مشرقی و مغربی فلسفوں اور نظریات کی کبھی مدھم اور کبھی تیز آواز بھی سنائی دیتی ہے۔

اقبال کی شخصیت ایک پہلو دار شخصیت تھی افکار کی گہرائی اور جذبات کی رنگینی سے ان کی شاعری مملو ہے۔ شاعری کے ابتدائی دور میں جذبات کی رنگینی، درد اور سوز و گداز انھیں اپنی شاعرانہ طبیعت کے علاوہ عطیہ فیضی کے فیضان کا بھی نتیجہ ہے جن سے وہ بے انتہا متاثر رہے

ہیں۔ اقبال کو متاثر کرنے والی شخصیتوں میں رومی، حالی، شبلی، غالب اور دیگر شخصیتوں کے بارے میں ہماری تاریخی وادبی کتابوں میں وافر مواد موجود ہے تاہم عطیہ بیگم کے بارے میں ہماری ادبی تاریخیں اور تذکرے خاموش ہیں۔ جس طرح اقبال کے مطالعہ میں مذکورہ علمی اور ادبی شخصیتوں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح عطیہ بیگم فیضی کی شخصیت کو جاننا اور اقبال سے ان کے مراسم اور جذباتی رشتہ کو سمجھنا بھی ضروری ہے

بمبئی کی علمی اور تہذیبی زندگی میں اٹھارہویں صدی کے اواخر سے یہاں کے کوکنی، بوہرہ اور میمن خاندانوں نے بڑی دلچسپی لی ہے۔ مہری، مقبہ، روگھے، کھٹکھٹے، سوبانی اور طیب جی خاندانوں کو ان کی پہلودار علمی، تہذیبی اور تجارتی خدمات کے لئے ہمیشہ امتیازی حیثیت حاصل رہی ہے۔ ان خاندانوں میں، کوکنی خاندانوں کو بمبئی کے مقامی باشندے ہونے کا فخر حاصل ہے۔ میمن اور بوہرہ خاندان انقلابِ زمانہ کے ہاتھوں بمبئی کی تجارتی اہمیت اور ہمہ جہت ترقی کے پیش نظر خوش آئند مستقبل کی تلاش میں انیسویں صدی کی ابتداء میں گجرات سے بمبئی منتقل ہوئے۔

کھمبات (گجرات) کے مسلمانوں میں حاجی بھائی نامی ایک بزرگ گزرے ہیں۔ ان کے لڑکے بھائی میاں نے معاش اور مستقبل کی تلاش میں بمبئی میں سکونت اختیار کی اور انیسویں صدی میں بمبئی کے مشہور تاجر کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ فروری ۱۸۰۳ء میں بمبئی کے فورٹ کے علاقہ میں زبردست آگ لگنے کی وجہ سے ان کا سارا اثاثہ نذرِ آتش ہوا تو اس پریشانی کے عالم میں انھوں نے اپنی بیوی حرمت ولی کو کھمبات بھیجا جہاں چند ماہ بعد ۲۰ر ستمبر ۱۸۰۳ء کو ان کے بڑے لڑکے طیب علی پیدا ہوئے جن کی پرورش ان کے دادا حاجی بھائی نے کی۔ بھائی میاں کے دوسرے لڑکے فیض حیدر تھے۔ بڑے لڑکے طیب علی کی اولاد بمبئی کا مشہور علمی خاندان ہے جو طیب جی کے لقب سے مشہور ہے۔ مشہور قومی رہنما جسٹس بدرالدین طیب جی اور ان کے بڑے بھائی قمرالدین طیب جی ملا طیب علی کے بیٹے ہیں۔ بھائی میاں کے چھوٹے بیٹے فیض حیدر کی اولاد فیضی خاندان کے لقب سے مشہور ہوئی۔ فیض حیدر کی متاع واحد ان کے لڑکے حسن علی فیض حیدر تھے جو استنبول میں سکونت اختیار کرنے کی

وجہ سے حسن علی آفندی کے لقب سے بھی مشہور ہوئے۔ حسن علی کے سات اولادیں ہوئیں جن میں چار لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں جو بالترتیب عمر حسبِ ذیل ہیں۔

علی اکبر، علی اصغر، زہرا بیگم، نازلی رفیعہ بیگم، عطیہ بیگم، علی اظہر اور علی اطہر۔ مشہور عالم اور قانون داں پروفیسر آصف فیضی علی اصغر کے بیٹے ہیں۔ طیب جی خاندان کی طرح جس نے عدل وانصاف اور سماجی بہبود ورفاہِ عامہ کے لئے شہرت پائی، فیضی خاندان کو بھی بمبئی کی علمی و ادبی فضا کو معطر رکھنے کا شرف حاصل ہے جن میں زہرا بیگم، نازلی رفیعہ بیگم اور عطیہ بیگم نے بہ وجوہ شہرت پائی۔ پروفیسر فیضی اس خاندان کے اہم علمی ستون تھے جنہیں بمبئی کی تہذیبی تاریخ میں ہمیشہ اہمیت حاصل رہے گی۔

انیسویں صدی کے ربع آخر اور انیسویں صدی کے ربع اول میں بمبئی نے جو اردو زبان وادب کی خدمات انجام دی ہیں ان میں سفرناموں اور ڈائریوں، شعر وسخن اور سماجی امور پر مضامین لکھنے اور تعلیم نسواں کی تحریک کو آگے بڑھانے میں زہرا بیگم، نازلی بیگم اور عطیہ بیگم فیضی کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ زہرا بیگم فیضی حسن علی فیض حیدر کی سب سے بڑی بیٹی تھیں۔ وہ ۲۹ رستمبر ۱۸۶۶ء میں بمبئی میں پیدا ہوئیں اور ۲۳ ردسمبر ۱۹۴۰ء میں بمبئی میں وفات پائی۔ حسن علی فیض حیدر کی دوسری لڑکی نازلی رفیعہ بیگم یکم مارچ ۱۸۷۴ء میں استنبول (ترکی) میں پیدا ہوئیں۔ غالباً ۱۸۸۶ء میں ان کی شادی سید سیدی احمد (نواب آف جنجیرہ) سے ہوئی جو بمبئی کے جنوب میں ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ پاکستان کے قیام کے بعد آپ کراچی چلی گئیں اور ۹ رستمبر ۱۹۶۸ء کو کراچی میں انتقال ہوا۔

ان تینوں بہنوں میں عطیہ بیگم فیضی سب سے چھوٹی تھیں۔ وہ یکم اگست ۱۸۷۷ء میں آطہ (ترکی) میں پیدا ہوئیں۔ ان کی زندگی کا ابتدائی دور جنجیرہ میں اپنی بہن نازلی رفیعہ بیگم (بیگم آف جنجیرہ) کے ساتھ گزرا۔ کچھ عرصہ وہ اپنے والد حسن علی کے ساتھ استنبول میں بھی رہیں۔ ۱۹۰۶ء میں عطیہ بیگم کو حکومتِ ہند نے انگلستان میں اعلیٰ تعلیم کے لئے وظیفہ دیا۔ انھیں ابتداء ہی سے امورِ تعلیم اور بطورِ خاص تعلیمِ نسواں سے گہری دلچسپی تھی۔ لہٰذا وہ حکومت کے وظیفہ پر مستقبل میں اپنے تعلیمی پروگرام کے پیشِ نظر اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن گئیں۔ بقول خود:

”میں ۱۹۰۶ء میں گورنمنٹ اسکالرشپ لے کر لندن گئی تھی مقصد سفر یہ تھا کہ میں معلمہ بن کر وہاں سے واپس آؤں اور اپنی ہم وطن بہنوں کی خدمت کروں، لیکن وہاں پہنچ کر علیل ہوگئی اور تیرہ مہینے پردیس میں مشکل سے گزار کر بے نیل ومرام واپس آگئی۔“ (دیباچہ ”زمانہ تحصیل“ از عطیہ بیگم رحمین (یہ نادرونایاب سفرنامہ راقم کے زیر ترتیب ہے)

ان کے سفرنامہ ”زمانۂ تحصیل“ سے ظاہر ہوتا ہے کہ عطیہ بیگم سفر یورپ پر یکم ستمبر ۱۹۰۶ء کو روانہ ہوئیں اور ۲۷رستمبر ۱۹۰۷ء کو اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر ہندوستان (بمبئی) واپس لوٹیں۔ اسی سفر کے دوران یکم اپریل ۱۹۰۷ء کو اقبال کی عطیہ بیگم سے پہلی ملاقات ہوئی۔ عطیہ بیگم نے ہندوستان واپس ہوتے ہوئے ہالینڈ، جرمنی (ہائیڈل برگ)، میونخ اور فرانس (پیرس) کا بھی سفر کیا۔ یورپ کے اس سفر کے دوران ۲۲راپریل ۱۹۰۷ء میں جب عطیہ بیگم مسز سید علی بلگرامی کی دعوت پر کیمبرج گئیں، یہاں ان کی اقبالؔ سے دوسری ملاقات ہوئی۔ بقول عطیہ بیگم:

”مسٹر اقبال بھی تشریف رکھتے تھے۔ یہ صاحب نہایت درجہ عالم، فاضل اور فیلسوف اور شاعر ہیں۔“

انگلستان سے ہندوستان لوٹتے وقت اقبال دورانِ سفر ہائیڈل برگ اور میونخ میں عطیہ بیگم کے ساتھ رہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یکم اپریل ۱۹۰۷ء کی پہلی ملاقات نے دریں اثنا دوستی، یگانگت او اعتماد کی سرحدوں میں قدم رکھا تھا۔ ۲۵راگست ۱۹۰۷ء کو بھی عطیہ بیگم اور اقبال ساتھ ہی سفر کرتے رہے، یہیں جرمنی میں کسی جگہ انھوں نے ایک مسجد دیکھی، بقول عطیہ بیگم:

”ایک مسجد بنی ہوئی ہے، اس کا منشا پورا پورا سمجھ میں نہیں آتا ہے، کوئی کہتا ہے ان کی بیگم مسلمان تھیں، کوئی کہتا دینِ اسلام کے دلدادہ تھے اور اس کی تعریف میں بنائی، یعنی مسجد کی وضع بنانے کی کوشش کی تھی اور ایک بات حیرت کی معلوم ہوئی کہ اللہ کا نام ہر جگہ موجود ہے۔ مگر پیغمبر آخرالزماں کا نام کسی جگہ پر نہیں تھا۔ نہ کسی جگہ مصلاً بنا ہوا ہے نہ منبر۔ مسٹر اقبال نے سب پڑھا اور کہنے لگے کہ صرف عمارت مشرقی ٹھاٹھ سے بنائی ہوئی ہے، مسجد کا پتہ معلوم نہیں ہوتا۔“

اس کے بعد کی تاریخوں میں بھی کسانوں کا رقص دیکھنے اور باغات کی سیر کا بیان ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں بھی اقبال عطیہ بیگم کے ساتھ رہے۔

اقبال کو قدرت نے وسعتِ دل و دماغ سے سرفراز کیا تھا۔ بلند پایہ افکار و خیالات کے ساتھ انہیں شاعرانہ دل بھی عطا ہوا تھا، ایسے میں عطیہ بیگم جو اقبال کے لئے عطیہ فیضی تھیں ان کے لئے سکونِ دل و دماغ کا کام کرتی رہیں۔ عطیہ بیگم کی ذہانت، علم و ادب سے شغف، فلسفیانہ مسائل سے دلچسپی، مسلمانوں کے مسائل سے ان کی ہمدردی اور علم موسیقی میں ان کی مہارت نے شبلی کی طرح اقبال کو بھی ان کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ یورپ اور خود ہندوستان میں بالخصوص پارسی عورتوں میں تعلیم کے شوق کو شبلی اور اقبال نے ذاتی طور سے بہت پسند کیا اور جب اسی شوق کو انھوں نے مسلم معاشرے میں تلاش کیا تو عطیہ فیضی کی ذات میں انہیں اپنا آئیڈیل نظر آیا۔ عطیہ فیضی کی شخصیت میں شبلی اور اقبال دونوں نے ہندوستانی مسلمان عورت کے خوش آئند مستقبل کو دیکھا جس کی ہمیں آج بھی ضرورت ہے۔

عطیہ بیگم نے ہندوستان لوٹنے کے بعد اپنی زندگی علمی، ادبی اور تعلیمی کاموں میں صرف کی، وہ تعلیمِ نسواں کی زبردست حامی تھیں، چنانچہ اس مقصد کے لئے انھوں نے پروگرام مرتب کئے اور جنجیرہ اور بمبئی میں لڑکیوں کی تعلیم کے لئے مدرسے قائم کیے۔ تعلیمِ نسواں سے ان کی دلچسپی کا اندازہ خود اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۰۶ء میں انگلستان جانے سے قبل انھوں نے ۱۹۰۵ء میں علی گڑھ میں منعقدہ پہلی لیڈیز کانفرنس میں بھی شرکت کی۔ اگرچہ عطیہ بیگم کی ابتدائی تعلیم گھر پر آپ کی والدہ امیر النساء بیگم کی نگرانی میں ہوئی، وہ متعدد مشرقی و مغربی زبانوں سے واقف تھیں۔ وہ انگریزی مادری زبان کی طرح جانتی تھیں۔ اس کے علاوہ ترکی، فارسی اور فرانسیسی سے بھی خوب واقف تھیں۔ انھوں نے کئی بار امریکہ و یورپی ممالک کی سیر کی۔ بیگم صاحبہ جنجیرہ نازلی رفیعہ بیگم کو ترکی کا درجہ اول کا ''شفقت نشان'' ملا تھا، عطیہ بیگم کو بھی دوسرے درجہ کا ''شفقت نشان'' کا تمغہ ملا۔ عطیہ بیگم کو ہندوستانی موسیقی میں مہارت حاصل تھی، چنانچہ اسی موضوع پر انھوں نے Indian Music کتاب بھی تصنیف کی جو ۱۹۲۹ء میں لندن کی .Luzac Co نے شائع کی۔ ۱۹۱۶ء میں بروڈہ میں جو موسیقی سے متعلق

کانفرنس ہوئی تھی، اس کی ابتدا کرنے والوں میں عطیہ بیگم پیش پیش رہیں اور ہندوستانی موسیقی کی ایک مرکزی اکیڈمی قائم کرنے اور اسکی شاخیں سارے ہندوستان میں پھیلانے میں آپ کوشاں رہیں۔ فرانس کی قدیم ترین یونیورسٹی ساربون میں عطیہ بیگم نے ہندوستانی موسیقی پر لکچر بھی دیئے۔ اسی طرح ۱۹۱۸ء میں آپ نے امریکہ کے تقریباً ۹۲ نہایت اہم تعلیمی اور معاشرتی حلقوں میں ماہرینِ فن کے سامنے تقریریں کیں۔ جب آپ کی تقریریں برلن میں ہو رہی تھیں تو سفیر افغانستان ادیب بے نے جو ہر میجسٹی ملکۂ افغانستان کے حقیقی بھائی تھے انہیں ''تمغۂ امانیہ'' سے نوازا۔ وہ ۱۹۲۵ء میں علی گڑھ کے جشن جوبلی میں بھی شریک ہوئیں اور بیس ہزار لوگوں کے جلسہ میں مسلمانوں کی کمزور تعلیمی پالیسی پر تقریر کی۔ عطیہ بیگم نے بمبئی کارپوریشن کے کاموں سے بھی گہری دلچسپی لی اور میونسپل اسکول کمیٹی کی غفلتوں اور خرابتوں کا پردہ چاک کرتی رہیں۔ لڑکیوں کے لئے بمبئی میں ان کا قائم کردہ اسکول ''صالحاتِ امین'' کو بڑی اہمیت ہے کہ اس سے مسلمان لڑکیوں میں تعلیم کا ذوق پیدا ہوا۔

اقبال جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے، عطیہ فیضی کی انھیں ذاتی صلاحیتوں سے متاثر تھے۔ انہیں اپنی زندگی کے لئے جس آئیڈیل عورت کی تلاش تھی وہ انھیں عطیہ بیگم میں نظر آئیں اور انھوں نے اپنے اس شدید اظہارِ پسندیدگی کا اظہار بھی کیا۔ اقبالؔ نے قیامِ یورپ کے دوران جو نظمیں لکھیں ان میں سے اکثر کا موضوع حسن وعشق ہے۔ وصال، حسن وعشق، کلی، فراق، سلمیٰ محبت اور.... کی گود میں بلی دیکھ کر جو بانگِ درا کے حصہ دوم میں شامل ہیں، ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء میں قیامِ یورپ کی یادگار ہیں۔ ان نظموں میں ''وصال'' اور حسن وعشق، بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ نظم ''وصال'' کا ابتدائی شعر ہے ؎

جستجو جس گل کی تڑپاتی تھی اے بلبل مجھے
خوبیٔ قسمت سے آخر مل گیا وہ گل مجھے

اس کے بعد کے دوسرے دو شعر ہیں ؎

خود تڑپتا تھا، چمن والوں کو تڑپاتا تھا میں
تجھ کو جب رنگیں نوا پاتا تھا، شرماتا تھا میں

میرے پہلو میں دل مضطر نہ تھا، سیماب تھا
ارتکابِ جرمِ الفت کے لئے بیتاب تھا

اسی نظم کے دوسرے بند میں عشق کو حسن کا اعتماد حاصل ہو گیا تو نظم کا لہجہ بدل گیا ہے

اب تاثّر کے یہاں میں وہ پریشانی نہیں
اہلِ گلشن پر گراں میری غزل خوانی نہیں
عشق کی گرمی سے شعلے بن گئے چھالے مرے
کھیلتے ہیں بجلیوں کے ساتھ اب نالے مرے
ضو سے اُس خورشید کی اختر مرا تابندہ ہے
چاندنی جس کے غبارِ راہ سے شرمندہ ہے

بعد میں اسی عشق کی بدولت اقبال کا باغِ سخن ہرا بھرا ہو گیا ہے

ہے مرے باغِ سخن کے لئے تو بادِ بہار
میرے بے تاب تخیل کو دیا تو نے قرار
جب سے آباد ترا عشق ہوا سینے میں
نئے جوہر ہوئے پیدا مرے آئینے میں
حسن سے عشق کی فطرت کو ہے تحریکِ کمال
تجھ سے سرسبز ہوئے میری امیدوں کے نہال
قافلہ ہو گیا آسودۂ منزل مرا

اقبال جب کیمبرج سے میونخ منتقل ہوئے تو عطیہ فیضی لندن میں مقیم تھیں اور دوستی اور رفاقت کو پائیداری خط و کتابت سے حاصل ہو گئی۔ اسی زمانہ میں اقبال نے عطیہ بیگم کو اپنی نظم ''وصال'' لکھ بھیجی تھی جس میں انھوں نے اپنے آپ کو اقبال کی بجائے ''دور افتادہ'' لکھنا پسند کیا تھا۔ اقبال اس نظم کی نقل اپنے پاس نہ رکھ سکے تھے چنانچہ ۱۷ر جولائی ۱۹۰۹ء کو ایک خط میں عطیہ فیضی کو لکھتے ہیں:

''کیا آپ مجھے اس نظم کی جو میں نے میونک سے آپ کو بھیجی تھی نقل

ارسال کرسکتی ہیں؟ میرے پاس اس کی کوئی نقل نہیں اور میں اسے محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔''

اسی خط میں اپنی مشترکہ دوست ایک جرمن خاتون کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اسے جواب لکھوں گا، تو وہ دن یاد کراؤنگا جب آپ جرمنی میں تھیں۔ افسوس کہ وہ دن ہمیشہ کے لئے گزر گئے۔'' ۷/اپریل ۱۹۱۰ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''ان دنوں کی یاد میں جو بیت چکے ہیں لیکن جن کی یاد میرے قلب میں تازہ ہے۔''

اقبال کی ان نظموں میں جن کے حوالے اس سے قبل دیئے گئے ہیں امید وبیم اور پاکر کھونے کا احساس بھی ہے۔ چنانچہ اس بات کی تصدیق ان کے اس خط سے بھی ہوتی ہے جو انھوں نے ۷/اپریل ۱۹۱۰ء کو عطیہ بیگم کو لکھا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

''ابھی چند روز ہوئے مجھے ایک اطالوی شہزادی کا خط آیا تھا، جس میں اس نے میری چند نظمیں مع انگریزی کے ترجمہ طلب کی تھیں، لیکن شاعری کے لئے میرے دل میں کوئی ولولہ موجود نہیں اور اس کی ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے۔''

اگرچہ اقبال نے اپنے دل میں شاعری کا ولولہ باقی نہ رہنے کا عطیہ بیگم سے گلہ کیا ہے اور انہیں کو اس کا مورِدِ الزام قرار دیا ہے تاہم اپنے جذبات کی آسودگی کے لئے اقبال نے وصال اور حسن وعشق جیسی اور بھی نظمیں کہیں لیکن بعد میں انہیں حد درجہ پرائیوٹ سمجھ کر تلف کردیا۔ ۷/جولائی ۱۹۱۱ء کو عطیہ بیگم کو اقبال لکھتے ہیں:

''گذشتہ پانچ سال سے میری نظمیں زیادہ تر پرائیوٹ نوعیت کی حامل ہیں اور میں سمجھتا ہوں پبلک کو انہیں پڑھنے کا حق نہیں۔ بعض تو میں نے خود تلف کرڈالی ہیں تاکہ کوئی انہیں چرا کر شائع نہ کردے۔''

اقبال اور عطیہ بیگم کی اس محبت کو تکمیل نصیب نہ ہوسکی اور ہندوستان کا ''جوگل'' انھیں

اپنی خوبیٔ قسمت سے لندن میں ملا ان کا نہ بن سکا۔ یہ ''گل''، یعنی عطیہ فیضی ۵ر دسمبر ۱۹۱۲ء کو مشہور مصور سیمول رحمین کے دامن سے وابستہ ہوگیا۔

عطیہ بیگم کی شادی کے بعد اقبال اور عطیہ بیگم کی دوستی یا خط وکتابت کے بارے میں ہمارے پاس کوئی دستاویزی ثبوت نہیں ہے۔ تاہم اس کا امکان ضرور ہے کہ ان دونوں کے دوستانہ اور عزیزانہ تعلقات رہے ہوں لیکن ۱۹۳۲ء میں جب عطیہ بیگم نے اقبال کی بمبئی آمد پر ''ایوانِ رفعت'' میں اقبال کے اعزاز میں ایک پارٹی دی جہاں محفلِ رقص وسرود کا بھی اہتمام کیا گیا تھا تو اقبال نے عطیہ بیگم کو آٹوگراف دیتے ہوئے یہ شعر تحریر کیا تھا ؎

عالمِ جوشِ جنوں میں ہے روا کیا کیا کچھ
کہئے کیا حکم ہے دیوانہ بنوں یا نہ بنوں

اس کے دو سال بعد ۱۹۳۸ء میں عالمی شہرت پاکر ہزاروں سوگواروں کو چھوڑ کر اقبال اس دنیا سے اٹھ گئے اور عطیہ قیامِ پاکستان کے بعد مستقبل کی تلاش میں کراچی میں بس گئیں، جہاں انتہائی بے چارگی اور کسمپرسی کے حالت میں اپنی زندگی کے آخری دن گزار کر ۴ر جنوری ۱۹۶۷ء کو اس دنیا سے چلی گئیں۔

اقبال عطیہ بیگم کو اپنی دوست اور رازدار سمجھتے تھے اور اپنے جذبات اور احساسات کو ان کے سامنے رکھتے تھے۔ ۱۹ر اپریل ۱۹۰۹ء کو ایک انتہائی جذباتی خط لکھا جس میں علی گڑھ کی فلسفہ کی پروفیسری اور لاہور گورنمنٹ کالج میں تاریخ کی پروفیسری سے انکار کے ساتھ اپنی، اس ملک سے کہیں بھاگ چلے جانے کے ارادے ہیں۔ اسی خط میں اقبال لکھتے ہیں:

''انسان ہونے کی حیثیت سے مجھے مسرت اور خوشی حاصل کرنے کا حق ہے، اگر سوسائٹی یا فطرت مجھے وہ حق دینے سے انکار کردے تو میں دونوں کا کھلم کھلا مقابلہ کروں گا۔ واحد علاج یہ ہے کہ میں بد بخت ملک کو چھوڑ کر کہیں چلا جاؤں گا یا پھر شراب نوشی میں پناہ لوں جو خودکشی کو آسان بنادیتی ہے۔ کتابوں کے مردہ بنجر اوراق مجھے مسرت نہیں دے سکتے۔'' اسی خط میں پھر اقبال لکھتے ہیں:

''براہِ کرم ان خیالات کے اظہار کے لئے معاف کیجئے گا۔ میں ہمدردی کا خواستگار

نہیں ہوں، میں تو صرف اپنی روح کے بوجھ کو اتار دینا چاہتا تھا۔ آپ میرے بارے میں سب کچھ جانتی ہیں۔ اور اسی وجہ سے میں نے اپنے خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنانے کی جرأت کی ہے۔"

عطیہ فیضی کے نام ایسے کئی خطوط ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ذہنی طور سے ان سے قریب بہت قریب تھے۔ عطیہ بیگم جو اقبال کی رازداں اور ہمدم دیرینہ تھیں، افسوس ہے کہ ان کے نام اقبال کے بیشتر خطوط کے ضائع ہو جانے سے، اقبال اور عطیہ بیگم کے تعلق سے کئی راز پوشیدہ رہ گئے کہ جن کی عدم موجودگی میں ان کے تعلقات پر حاشیہ آرائی تو کی جاسکتی ہے یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ان کی جرمن استاد ویگے ناست کے نام خطوط کی دریافت سے یہ بات مزید مشکلات پیدا کر دیتی ہے۔ عطیہ بیگم اور اقبال کے تعلقات جو ابتداً محبت اور رفاقت کا رنگ لیے ہوئے تھے اور جن میں احترام کا عنصر بدرجہ اتم موجود تھا ۱۹۱۳ء کے بعد صرف دوستانہ اور عزیزانہ رہے۔

۱۹۳۸ء میں اقبال کے انتقال کے بعد بمبئی میں اقبال کی یاد میں کئی جلسے منعقد کیے گئے ان جلسوں کے انعقاد میں اقبال کی دوست سروجنی نائیڈو ہمیشہ پیش پیش رہیں۔ انھوں نے یہ جلسے بمبئی کے مشہور ہوٹل تاج محل میں کیے تھے۔ اقبال کے انتقال کے بعد حیدرآباد میں بزمِ اقبال کا قیام عمل میں آیا۔ حیدرآباد کی حیثیت عطیہ بیگم اور اقبال دونوں کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ عطیہ بیگم کے عزیز سر اکبر حیدری، جو دولت عثمانیہ میں فنانس منسٹر تھے اور بہت بارسوخ شخصیت کے مالک تھے، ان سے اقبال کا اولین تعارف ۱۹۱۰ء میں عطیہ بیگم ہی نے کروایا تھا۔ حیدرآباد کی بزمِ اقبال، اقبال کی یاد میں ہمیشہ جلسے منعقد کرتی تھی۔ چنانچہ بزمِ اقبال ہی کی دعوت پر ۱۹۴۵ء میں عطیہ بیگم حیدرآباد پہنچیں اور بے شمار مداحین نے ان کا پرجوش خیر مقدم کیا۔[1] اپنے اس حیدرآباد کے قیام میں انھوں نے دیکھا کہ یہاں اقبال کے بے شمار مداح ہیں۔ انھوں نے اس موقع پر کہا:

"مجھے نواب حسن یار جنگ کی قائم کردہ بزمِ اقبال کے ایک جلسہ

[1] ۔ عبدالروف عروج: اقبال اور بزمِ اقبال حیدرآباد، مطبوعہ دارالادب (کراچی) ۱۹۶۸ء ص ۱۴۱ تا ۱۴۶

میں مدعو کیا گیا تھا۔ یہاں فلسفۂ اقبال کی تعلیم وتشریح، ایسی صداقت اور ایسی دلچسپی کے ساتھ عمل میں لائی جاتی ہے کہ میں نے ایسے ادارے کے قیام کی منشا کی طاقت کو محسوس کر لیا اور جب میں نے دیکھا کہ کس قدر تکلیف، قربانی اور محنت کے ساتھ کام جاری رکھا جاتا ہے تو مجھ پر غیر شعوری طریقے سے اس کی صداقت اور عزم کا اثر پڑا۔ میں نے نواب حسن یار جنگ کو اس اسلامی تعلیم کا، کہ علم کا حاصل کرنا سب سے افضل چیز ہے اور اس کی تلاش کے لیے انسان کو دنیا کے دوسرے کنارے بھی جانا چاہیے، مجسم نمونہ پایا۔''

عطیہ بیگم، حیدرآباد کے بزمِ اقبال کے اس جلسے سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ انھوں نے حیدرآباد سے بمبئی لوٹنے کے بعد اکیڈمی آف اسلام کے تحت یومِ اقبال منانے کا منصوبہ بنایا اور یہ جلسہ ۲۷ اور ۲۸/ اپریل کو منعقد کیا گیا، جس میں کثیر تعداد میں عاشقانِ اقبال اور مداحین جمع تھے۔ اس جلسہ میں حیدرآباد سے بھی کئی مہمان مدعو تھے۔ اس یومِ اقبال کی صدارت کے لیے انھوں نے نواب حسن یار جنگ کو مدعو کیا تھا۔[۱] عطیہ بیگم کی ہی قائم کی ہوئی اکیڈمی آف اسلام نے یہ جلسہ ۲۷/ اپریل ۱۹۴۶ء کو صبح کے وقت انجمن اسلام ہائی اسکول کے مشہور کریمی لائبریری ہال میں منعقد کیا جس میں کثیر تعداد میں اقبال کے چاہنے والے موجود تھے۔ جب نواب حسن یار جنگ اپنے احباب کے ساتھ انجمن اسلام ہائی اسکول پہنچے تو عطیہ بیگم نے ان کا گرم جوشی سے استقبال کیا اور پھر جلسے کی کارروائی شروع ہوئی۔ اس موقع پر نواب ہوشیار جنگ کا پیغام بھی پڑھ کر سنایا گیا۔ اس موقع پر پروفیسر نجیب اشرف ندوی نے

---

[۱] آصف جاہ اوّل کے خاندان کے امرا، امیرانِ پائگاہ کہلاتے تھے (پائگاہ بمعنی جاگیر)۔ نواب حسن علی یار جنگ انھیں امیرانِ پائگاہ میں سے تھے۔ وہ ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوئے۔ حیدرآباد، علی گڑھ اور انگلستان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ فارسی، اردو اور انگریزی پر عبور حاصل تھا۔ تقسیمِ ہند کے بعد پاکستان چلے گئے۔ ان کے عطیہ بیگم فیضی سے دوستانہ مراسم تھے۔ وہ اقبال کے مداح تھے اور حیدرآباد میں اقبال کے ۱۹۳۸ء میں انتقال کے بعد قائم کی گئی ''بزمِ اقبال'' کے صدر رہے۔ عطیہ بیگم کی انگریزی کتاب انھیں کے اصرار پر بمبئی سے شائع ہوئی تھی۔ ۹/ اگست ۱۹۸۵ء میں کراچی میں انتقال ہوا۔ (دلوی)

اس جلسے کو مخاطب کیا۔ انھوں نے کہا:[1]

"حضرات! میری معروضات کا سلسلہ سب سے بڑے زندہ شاعر اقبال تک محدود ہے۔ اقبال کی شہرت، ان کی لیاقت، ان کا تبحر، ان کی سیاست دانی، ان کا فلسفہ، ان کی عام اصلاحی شاعری، ایسی چیزیں ہیں جو کسی تعریف و تعارف کی محتاج نہیں۔ نہ صرف ہندوستان، نہ صرف عالمِ اسلام، نہ صرف عالمِ قدیم، بلکہ ساری علمی، ادبی، سیاسی اور مذہبی دنیا ان کے خصائص سے واقف ہیں۔"

اس کے بعد ندوی صاحب نے اقبال کے حالاتِ زندگی اور ماحول کا تجزیہ پیش کیا تاکہ اقبال فہمی کا اور ان کے پیغام کو سمجھنے کا حق ادا ہو سکے۔ اس موقع پر اخبار خلافت کے سابق ایڈیٹر رئیس احمد جعفری نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اقبال کے حوالے سے اپنی یادیں بیان کیں۔ اس موقع پر مشہور عالم اور ادیب اور انجمن اسلام کے سابق استاد اور بعد میں چیف ٹرانسلیٹر، ریاستِ بمبئی، ضیاء الدین احمد برنی نے بھی حاضرین کو مخاطب کیا اور اپنی یادیں بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"گول میز کانفرنس سے لوٹتے وقت اقبال نے بمبئی میں چند دن قیام کیا تھا۔ اس موقع پر محترمہ عطیہ بیگم صاحبہ نے ان کے اعزاز میں اپنے تاریخی مکان "ایوانِ رفعت" میں ایک شاندار پارٹی کا انتظام کیا تھا جس میں روسا اور مہاراجگان کے علاوہ اسلامی ممالک کے قونصل اور مرزا علی اکبر خان مرحوم، جج ہائی کورٹ، بمبئی، مولانا محمد عرفان مرحوم، ڈاکٹر جی۔ ایم۔ ڈی صوفی جیسے بہت سے فاضل حضرات بھی تشریف فرما تھے۔ اس وقت جب حاضرین سے ان کا تعارف کرایا جا رہا تھا تو میں دیکھ رہا تھا کہ لوگ ان سے نہایت عقیدت مندانہ احترام سے مل رہے تھے۔ حالانکہ ان میں سے بعض ایسے بھی تھے، جنھوں نے اقبال کو صرف نام ہی سے جانا تھا اور ان کے

[1] عبدالرؤف عروج: اقبال اور بزمِ اقبال حیدر آباد، مطبوعہ دارالادب (کراچی) ۱۹۶۸ء ص ۱۴۱ تا ۱۴۶

شاعرانہ کمالات سے مطلق واقف نہ تھے۔"

انڈین پی ای این (Indian P.E.N.) کے یکم جون ۱۹۴۶ء کے شمارے میں اس جلسہ کی روداد بھی شائع ہوئی تھی جیسا کہ سب جانتے ہیں، عطیہ بیگم کے اقبال سے گہرے دوستانہ مراسم تھے اور ان دونوں میں خط و کتابت بھی رہی اور وہ اپنی ڈائری بھی لکھتی رہیں۔ جب اقبال پر، ان پر تحقیقات کا آغاز ہوا تو نواب حسن یار جنگ ہی کی فرمائش اور اصرار پر عطیہ بیگم نے اپنی ڈائری اور خطوط شایع کیے۔ یہ کتاب بمبئی سے فروری ۱۹۴۷ء میں اکیڈمی آف اسلام نے شایع کی۔ یہ کتاب انگریزی میں تھی۔ اس کا ترجمہ ضیاء الدین برنی صاحب نے اردو میں کیا۔ اس کے بعد اس کے دوسرے بھی اردو میں کئی ترجمے ہوئے جن میں عبدالعزیز خالد، نورالحسن نقوی کے ترجمے بھی شامل ہیں۔ جب یہ کتاب انگریزی میں پہلی بار شائع ہوئی تو نواب حسن یار جنگ نے اس کا ایک نسخہ قائداعظم محمد علی جناح کے نام بھی بھیجا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کے بعد عطیہ بیگم فیضی اپنی بڑی بہن بیگم صاحبہ آف جنجیرہ نازلی رفیعہ بیگم اور بہنوئی فیضی رحمین کے ساتھ کراچی منتقل ہوئیں۔ پاکستان ہجرت کرنے سے پہلے ایک الوداعی جلسہ انجمن اسلام کی کریمی لائبریری میں منعقد ہوا جس کی صدارت ممتاز سیاست دان اور اقبال اور عطیہ بیگم کی مشترکہ دوست سروجنی نائیڈو نے کی۔ وہ بصد اصرار مشورہ دیتی رہیں کہ وہ سب ہندوستان ہی میں رہیں۔ لیکن عطیہ بیگم نہ مانیں اور اپنی جذباتیت کی رو میں بہہ کر پاکستان منتقل ہوگئیں۔ پاکستان منتقل ہونے کے بعد ان پر جو بھی گزری وہ ایک طویل کہانی ہے جو ایک دوسرا مقالہ چاہتی ہے۔ تاہم پاکستان منتقل ہونے کے بعد جب کراچی میں ۱۹۵۴ء میں یومِ اقبال منایا گیا تو عطیہ بیگم بھی سامعین میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ سیمنار میں اقبال کی شخصیت، شاعری اور فلسفے پر تقریریں سننے کے بعد مجمع میں سے عطیہ بیگم اپنے تمام تر بڑھاپے کے ساتھ کھڑی ہوئیں اور کہا کہ آپ لوگوں نے اقبال کو 'ولی اللہ' کا درجہ دیا ہے لیکن آپ کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اقبال ایک انسان تھے۔"[1]

اقبال اور عطیہ بیگم کے دوستانہ مراسم، عشق و محبت کی ایک رنگین داستان کی حیثیت سے

[1] ۔ ایسٹ اینڈ ویسٹ (East and West) سیمنار کی مطبوعہ روداد

اردو زبان وادب کی تاریخ میں محفوظ ہیں اور وقتاً فوقتاً مختلف انداز سے ان کے تعلقات پر تبصرے ہوتے رہتے ہیں۔ عطیہ بیگم کے عزیزانہ مراسم پاکستان کے مشہور محقق مشفق خواجہ سے تھے۔ میرے برادر بزرگ جناب شاہد علی خاں (مدیر نئی کتاب، دلّی) کے مشفق خواجہ سے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ چنانچہ دلّی میں مشفق خواجہ صاحب سے ملاقات کے دوران جب ان سے عطیہ بیگم سے، ان کے اقبالؔ سے رنگین صفحے سے متعلق مشفق خواجہ سے دریافت کیا تو بقول مشفق خواجہ:

''عطیہ بیگم نے اس جذباتی رشتہ کی توثیق کی۔''

میرے دوست پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے بھی مجھے ٹیلیفون پر اور پھر ذاتی طور پر بمبئی میں بتایا کہ مشفق خواجہ سے انھوں نے بھی کراچی میں یہی سوال کیا تھا اور بتایا تھا کہ عطیہ بیگم نے اس داستان رنگین کی توثیق کی تھی۔ عطیہ بیگم کے اقبالؔ سے یہ دوستانہ مراسم زندگی بھر قائم رہے اور اقبالؔ کے انتقال کے بعد اقبالؔ شناسی اور تحقیق کے سلسلے میں وہ پیش پیش رہیں۔ عطیہ بیگم کا ۴ رجنوری ۱۹۶۷ء میں کراچی میں انتقال ہوا اور وہ وہیں سلیمانی بوہرہ قبرستان میں اپنی بہن نازلی رفیعہ بیگم اور اپنے شوہر فیضی رحیمن (اسلامی نام نور محمد) کے پہلو میں مدفون ہیں۔

مراجع:

۱۔ حیات و ممات: فیضی اور طیب جی خاندان کی تاریخیں۔ مرتبہ: علی اصغر فیضی/ آصف علی اصغر فیضی

۲۔ Indian Whos Who Edited : Waman P. Kabadi

۳۔ Whos who in India - Poona

۴۔ اخبارِ اتِ معلیٰ (طیب جی اور فیضی خاندان کے قلمی اخبار: ابتدائی دور) مخزونہ بمبئی یونیورسٹی لائبریری

۵۔ سوانح: طیب علی بھائی میاں (انگریزی) مرتبہ پروفیسر آصف فیضی۔ بمبئی ایشیاٹک لائبریری

۶۔ اقبال اور عطیہ بیگم اردو ترجمہ: ضیاء الدین برنی

۷۔ پروفیسر آصف فیضی سے ملاقاتیں اور گفتگو، ۸۱-۸۰-۱۹۷۹ء

۸۔ زمانۂ تحصیل (ڈائری/سفرنامہ) عطیہ بیگم،

۹۔ اقبال اور بزمِ اقبال۔ عبدالروٗف عروج

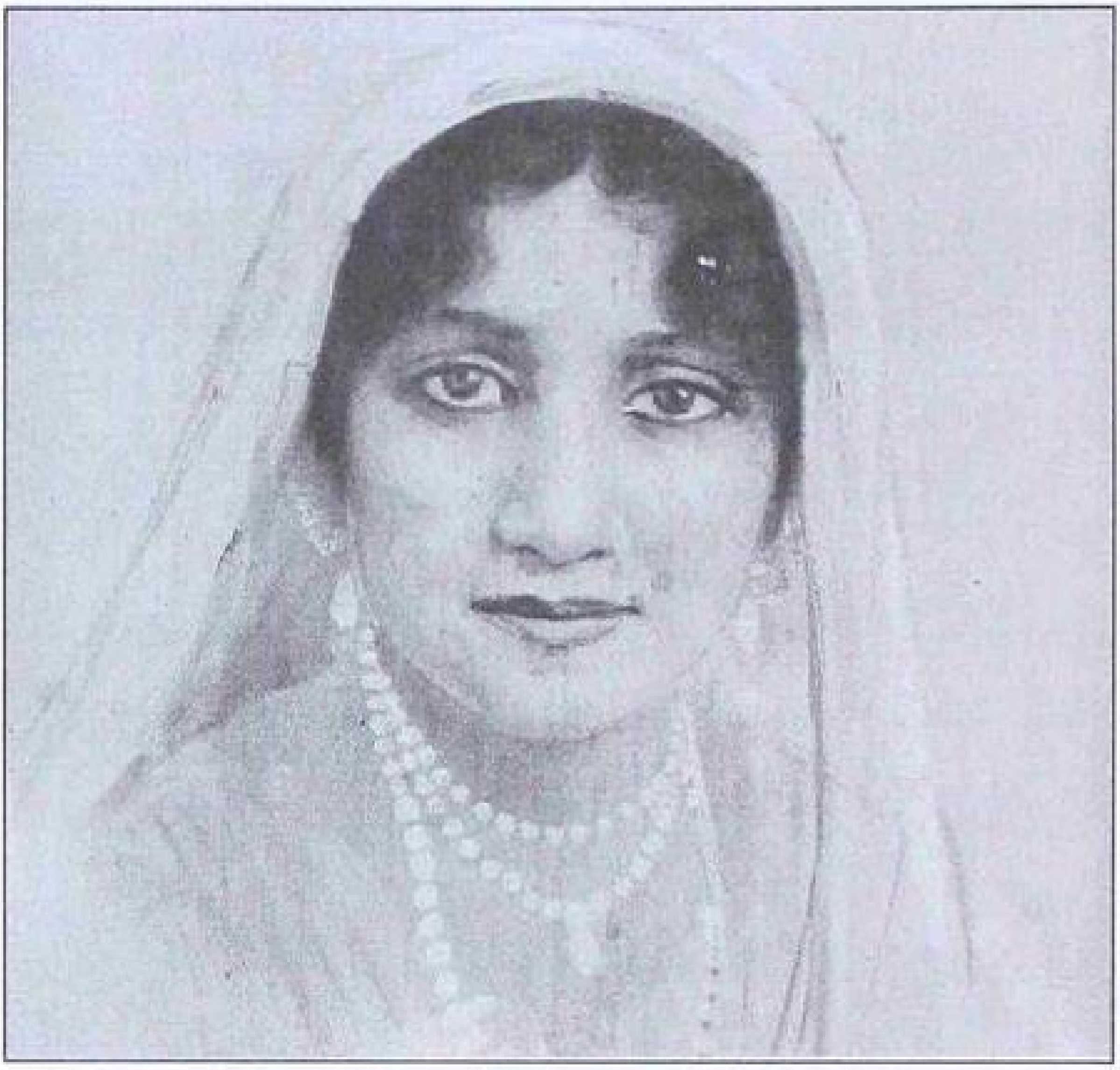

عطیہ بیگم فیضی

۱۸۷۷ء سے ۱۹۶۷ء

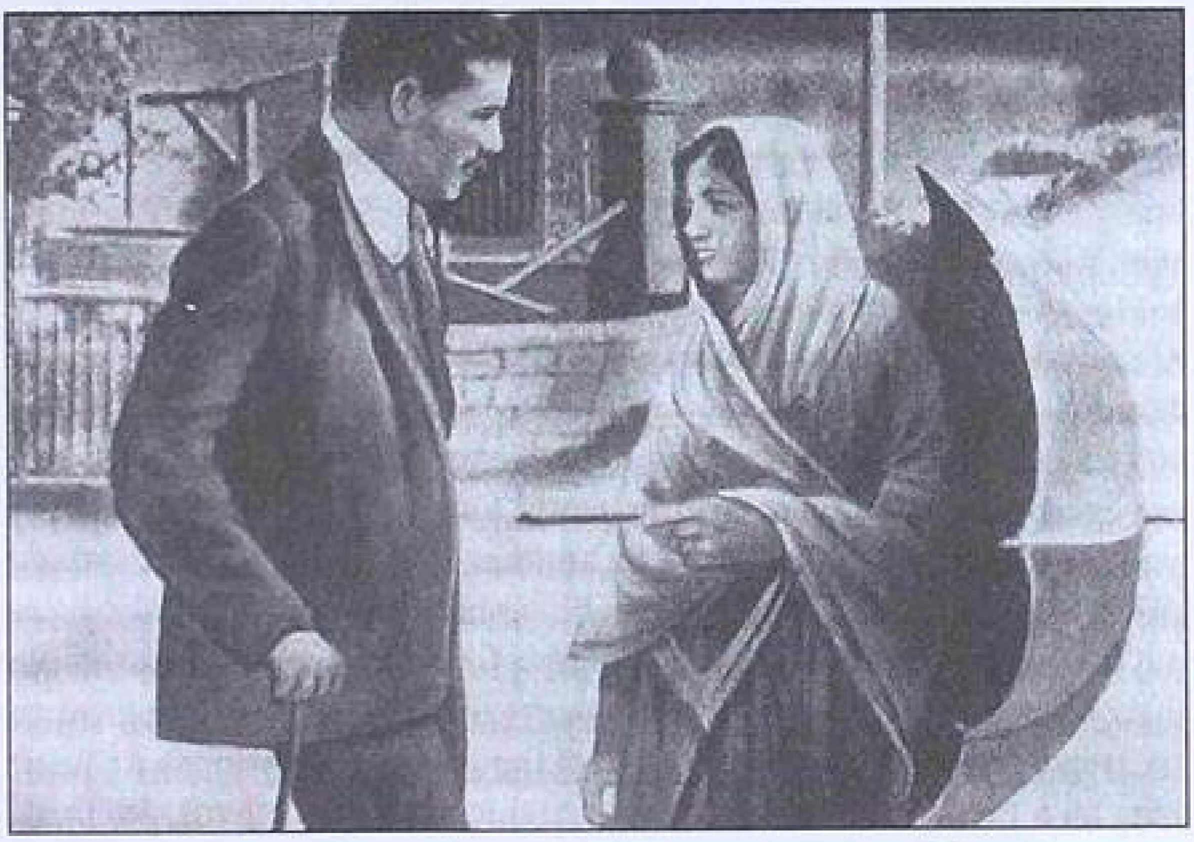

عطیہ بیگم اور اقبال ۔ ہیڈل برگ (جرمنی) میں ۱۹۰۷ء

اکیڈمی آف اسلام بمبئی نے یومِ اقبال منایا۔ اس موقع پر نواب حسن یار جنگ افتتاحی تقریر کر رہے ہیں۔ تصویر میں ان کے قریب ہی اکیڈمی کی سیکریٹری عطیہ بیگم بیٹھی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں۔

(بشکریہ: اقبال اور بزمِ اقبال حیدر آباد۔ از عبدالرؤف عروج)

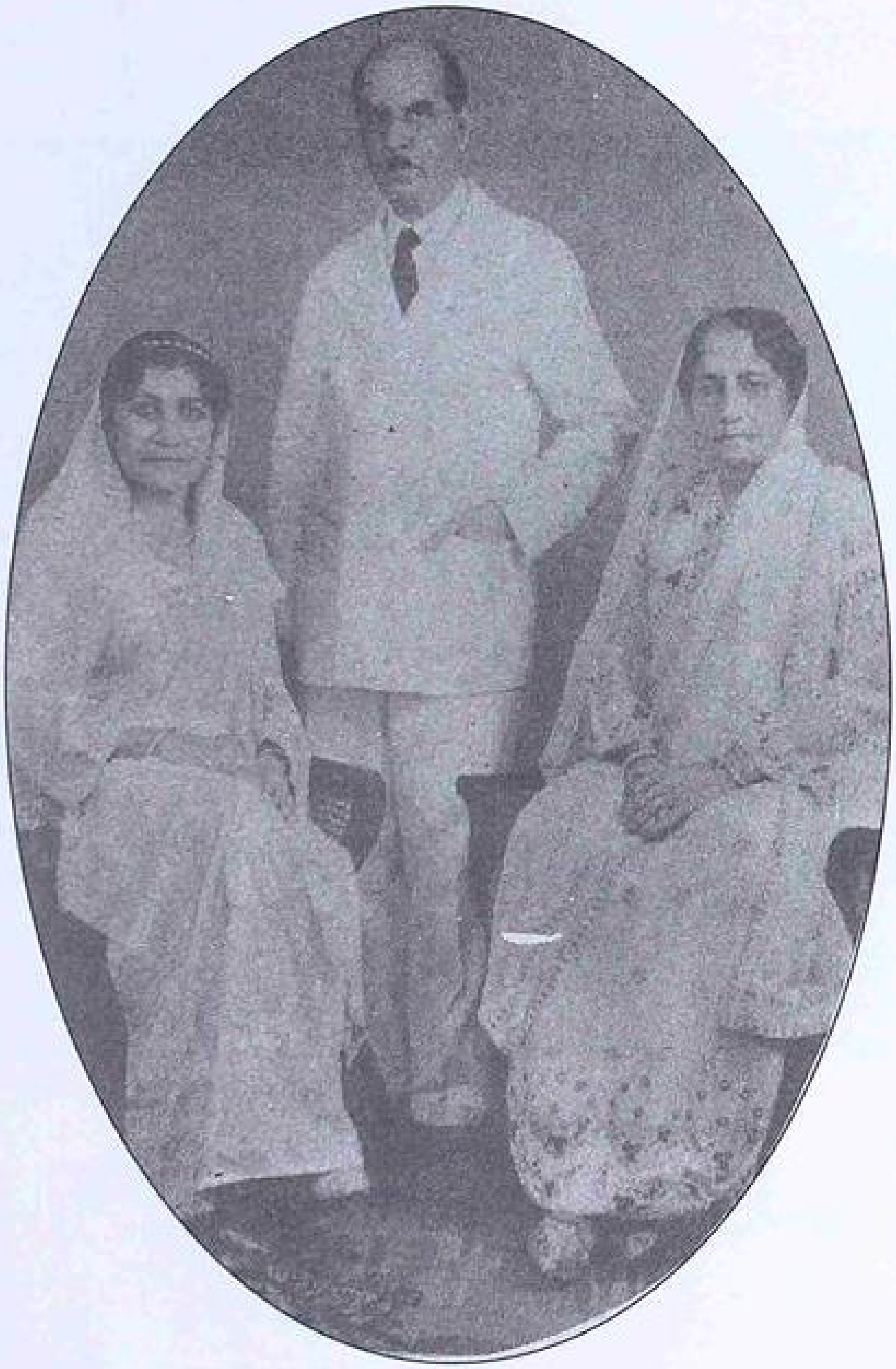

عطیہ بیگم، فیضی راحمین اور نازلی بیگم ایک پرانی تصویر

اقبال کا ایک غیر مطبوعہ خط

(بیگم صاحبہ نازلی رفعیہ بیگم، جنجیرہ کے حوالے سے)

عطیہ بیگم فیضی کی بڑی بہن نازلی رفعیہ بیگم کی شادی ۱۸۸۶ء میں بعمر ۱۳-۱۴ سال نواب آف جنجیرہ سدی احمد خان سے ہوئی۔ یہ شادی عرصۂ دراز تک قائم رہی۔ نازلی رفعیہ بیگم نے اپنے قیامِ جنجیرہ کے زمانے میں ریاست جنجیرہ کی فلاحی اور تعلیمی خدمات بھی انجام دیں اور وہ ہمیشہ اپنے شوہر کی ممد و معاون رہیں۔ نازلی رفعیہ بیگم کی وجہ سے ان کی چھوٹی بہن عطیہ بیگم فیضی کا قیام بھی اکثر جنجیرہ میں رہا۔ بمبئی اور جنجیرہ کی حیثیت گھر آنگن کی تھی۔ اس خاندان کا اکثر بمبئی آنا ہوتا یا پھر یہ لوگ اپنی عمر دراز کے چند ماہ جنجیرہ میں گزارتے۔ جنجیرہ کے نواب کا محل احمدی پیلیس سمندر کے کنارے ایک پر فضا مقام تھا جو آج بھی دعوتِ نظارہ دیتا ہے۔ فیضی خاندان کے ہندوستان کے سیاسی اور سماجی اور علمی خاندانوں سے گہرے رشتے تھے۔ مولانا شبلی نعمانی اور سروجنی نائیڈو اکثر اپنا وقت لبِ سمندر احمدی پیلس میں گزارتے۔ سروجنی نائیڈو نے، جو ہندوستانی انگریزی کی بلند پایہ شاعرہ تھیں۔ جنجیرہ کے حسن سے متاثر ہو کر نظم کہی تھی۔ شبلی کے جنجیرہ آنے جانے کے بھی وافر مواقع تھے۔ اپنے مطالعے اور تصنیفی کاموں کے لئے بھی شبلی نے اپنے اوقات جنجیرہ میں گزارے اور سیرۃ النبی کی تصنیف کے علاوہ، جس کی

ابتدا انھوں نے جنجیرہ میں کی، جنجیرہ کے حسن سے متاثر ہو کر انھوں نے نظم بھی کہی۔ اس طرح شبلی کے تعلقات جنجیرہ اور نواب صاحب کے ساتھ عطیہ بیگم اور نازلی رفیعہ بیگم کے ساتھ بھی تھے۔ نازلی رفیعہ بیگم نے تعلیمِ نسواں کے سلسلہ میں بھی قدم آگے بڑھایا اور جنجیرہ میں ایک اسکول کی بنیاد بھی رکھی۔ وہاں سڑکیں بنوائیں اور دوسرے رفاہی کام بھی کیے۔ وہ ادبی مزاج رکھتی تھیں۔ ۱۹۰۵ء میں اس خاندان کے افراد نے برطانیہ اور دیگر یوروپی ممالک کا سفر بھی کیا۔ اس سفر کی یادگار نازلی رفیعہ بیگم کا مشہور سفرنامہ ''سیر یوروپ'' ہے جو ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا۔ زندگی کے کئی سال نازلی بیگم نے نواب سدی احمد خان کے ساتھ گزارے مگر انھیں اولاد کی خوشی میسر نہ ہوئی اور نواب سدی احمد خان کے تخت کے وارث کا مسئلہ شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔ لہٰذا انھوں نے اولادِ نرینہ اور تخت کے وارث کی ضرورت کی خاطر تیسری شادی کا ارادہ ظاہر کیا جس کے لئے بیگم صاحبہ جنجیرہ نازلی رفیعہ بیگم راضی نہیں تھیں۔[۱] اس سے دل کی دوریاں بڑھنے لگیں۔ ہر چند کہ نواب صاحب نے نازلی رفیعہ بیگم کو بہت سمجھانے کی کوشش کی۔ جب نازلی رفیعہ بیگم نے بہت ضد کی تو جنجیرہ کے لیے وارث کے خیال سے انھوں نے تیسری شادی کلثوم نامی ایک خاتون سے کی اور بادلِ ناخواستہ نازلی رفیعہ بیگم کو ساز و سامان اور کثیر دولت اور ہیرے جواہرات کے ساتھ ایک جہاز سے بمبئی روانہ کیا اور اس طرح ان کی طلاق ہو گئی۔ اس طلاق میں نازلی رفیعہ بیگم کو ماہانہ اخراجات کے لئے تین ہزار روپے طے کیے گئے اور ساتھ ہی یہ طے پایا کہ نازلی رفیعہ بیگم سرکاری ٹائٹل یعنی بیگم صاحبہ کا خطاب بھی استعمال کرنے کی مجاز ہوں گی۔ نازلی رفیعہ بیگم کی یہ طلاق ۱۹۱۴ء میں ہوئی[۲] اور انھوں نے بمبئی میں ملبار ہل پر ایک عالیشان محل تعمیر کر کے اپنی بہن عطیہ بیگم اور بہنوئی فیضی رحمین کے ساتھ سکونت اختیار کی۔ یہ محل مالابار ہل پر سنگِ سرخ سے تعمیر کیا گیا تھا جس کا نام ''ایوانِ رفعت'' تھا۔

اپنی بہنوں زہرا فیضی اور عطیہ فیضی کی طرح نازلی رفیعہ بیگم بھی صاحبِ علم خاتون تھیں

---

[۱] یہ بات راقم کو نازلی رفیعہ بیگم کے بھتیجے مشہور عالم و محقق پروفیسر آصف فیضی صاحب نے ۱۹۷۸ء میں راقم کو بتائی تھی۔

[۲] ایضاً

اور ادبی ذوق رکھتی تھیں جو انھیں ورثہ میں ملا تھا۔ نواب سدی احمد خان بھی اعلیٰ سوجھ بوجھ کے مالک تھے اور تعلیم، رفاہِ عامہ کے ساتھ اپنی رعایا میں آپسی فرقہ وارانہ یکجہتی اور انصاف پسندی کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں مقبول اور محبوب تھے۔[1] انھیں ۱۸۹۵ میں (Sir) KCIE کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔ جیسا کہ ماقبل السطور میں بیان کیا گیا ہے، نواب سدی احمد خان کے ایک لمبے عرصہ تک بیگم صاحبہ نازلی رفیعہ بیگم کے ساتھ پر سکون ازدواجی زندگی گذاری، حکومت کے کاموں میں برابر کے شریک رہے مگر وراثت کے لیے اولادِ نرینہ سے محروم رہے اور اس کمی نے ان کی زندگی کو تلخ بنایا تو ۱۹۱۵ء میں بحالتِ مجبوری علیٰحدگی اختیار کرنی پڑی۔ لیکن نان ونفقہ کے لئے ماہانہ تین ہزار روپے اور سرکاری اعزاز (بیگم صاحبہ) نازلی بیگم کے نام کا جزو بنا رہا۔ ۱۹۲۲ء میں نواب سدی احمد خان کا انتقال ہوا۔[2] ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے سدی محمد خان تخت کے وارث بنے۔ چونکہ نواب سدی محمد خان ابھی کم سن تھے، لہٰذا ان کی والدہ بیگم کلثوم کو رواج کے مطابق ان کا اتالیق مقرر کیا گیا۔ اس دوران سدی محمد خان نے اپنے والد سدی احمد خان کی طرح پرنسس کالج اور پونے کے فرگوسن کالج میں تعلیم حاصل کی۔[3] لیکن بہت جلد بیگم صاحبہ نازلی رفیعہ بیگم کے لئے مختص کفالت اور بیگم صاحبہ کے خطاب کو واپس لینے کے لئے بات جنجیرہ کی عدالت تک پہنچی۔ کوشش غالباً یہی تھی کہ نان ونفقہ کی رقم اور بیگم صاحبہ کا خطاب واپس لیا جائے یا ۳۰۰۰ روپیوں کی رقم کو کم کیا جائے۔[4] اس سلسلے میں کسی قسم کا آخری فیصلہ کرنے کا اختیار ریاست کے گورنر کو نہیں بلکہ صرف وائسرائے ہی کو حاصل تھا۔ لہٰذا غالباً عطیہ بیگم ہی نے جو اقبال کی قریبی دوست تھیں، اقبال سے جو سرکاری حلقوں میں معروف شخصیت ہونے کے علاوہ قانون کے ماہر بھی تھے، یہ سفارش کی کہ وہ اس قضیہ میں ان کی مدد کریں، چنانچہ درج ذیل خط سے انداز ہوتا ہے کہ اقبال

---

[1] Short......... : History of Janjira State, Page - 39

[2] ایضاً

[3] ایضاً

[4] اس قضیہ کو سلجھانے کی کوشش بمبئی کے گورنر لارڈ ولنگڈن نے بھی کی تھی۔

نے اس قضیہ کے تعلق سے وائسرائے سے بات کی ہوگی اور پھر دوبارہ درج ذیل خط وائسرائے کے سکریٹری کو لکھا کہ وہ اس سلسلے میں وائسرائے کی یاددہانی کرائیں اور شیعہ سنی مسلک کے لحاظ سے قانونی نکات سے بھی ہز ایکسلینسی وائسرائے کو آگاہ کرائیں۔ اقبال کا یہ ایک نایاب اور غیر مطبوعہ خط ہے جس سے ریاست جنجیرہ کے اس قضیہ سے متعلق ہمیں آگاہی ہوئی ہے اور اس طرح شاعرِ مشرق اقبال کی ایک نادر و نایاب تحریر بھی اہلِ علم کے سامنے آئی ہے۔ اقبال کے اس انگریزی خط مورخہ ۱۷/۱پریل ۱۹۳۳ء کا اردو ترجمہ ہدیہ قارئین ہے۔[۱]

ڈاکٹر سر محمد اقبال

ایم۔اے۔۔پی ایچ ڈی لاہور

بیرسٹرایٹ لاء

۱۷/۱پریل ۱۹۳۳

لاہور

میرے عزیز مسٹر میویلے،

میں آپ کو یہ درخواست اس لئے لکھ رہا ہوں تا کہ آپ براہ کرم اس ملفوف محضر نامہ کو ہز اکسیلنسی (فضیلت مآب) وائسراے کی خدمت میں پیش کرسکیں۔ جب حال ہی میں، ایک مختصر وقت پہلے، مجھے فضیلت مآب سے ملنے کا شرف حاصل ہوا تھا تو اس وقت میں نے ان کی توجہ معاملے کے کچھ اور اہم پہلوؤں کی جانب مبذول کرائی تھی، اور ہز اکسیلنسی نے حسن

---

[۱]۔ یہ انگریزی خط لندن کی مشہور انڈیا آفس لائبریری میں نمبر 10R/R/1/1/2407 File 263-P(S)/1933 کے ساتھ محفوظ ہے۔ اس خط کی نقل کے لیے میں عزیزی دانش خان کا شکر گزار ہوں جن کی تگ و دو سے مجھے یہ خط حاصل ہوا۔ اس خط کے تعلق سے اسی فائل میں یہ بھی درج ہے کہ اقبال کے اس خط کی روشنی میں حکومت بیگم صاحبہ کے حق میں کوئی فیصلہ کرے، مگر بعد میں اس سلسلے میں کوئی کارروائی نہ ہوسکی اور یہ تنازعہ جوں کا توں دھرا رہا۔ عزیزی دانش نے مجھے یہ تفصیل لندن سے ۱۲/مئی ۲۰۱۲ء کو بتائی۔

اقبال کے انگریزی خط کے ترجمے میں عزیزی محمد ہاشم خان نے میری مدد فرمائی اور امکان بھر تعاون سے نوازا جس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ (عبدالستار دلوی)

سلوک کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا تھا کہ وہ وسط اپریل میں اس تعلق سے حتمی فیصلہ کریں گے کیونکہ تب تک ہزا کسلینسی کے خیال کے مطابق بامبے پریسیڈنسی اسٹیٹ براہ راست وائسرائے کے ماتحت آجائے گی۔ ہزا کسیلنسی حقائق سے اچھی طرح واقف ہیں کہ کیونکہ اس کیس کے ایک مرحلے پر فضیلت مآب لارڈ اینڈ لیڈی ویلنگڈن نے اس معاملے میں دلچسپی لی تھی اور فریقوں کے درمیان سمجھوتہ کرایا تھا۔

مجھے بمشکل یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ یہ معاملہ بڑی اہمیت کا حامل ہے بالخصوص اس لئے کہ اس میں اسلام کے عائلی قانون کا ایک بہت اہم نکتہ شامل ہے جس کی بنیاد پر، زنجیرہ کی عدالتوں کے ذریعے ایک غلط فیصلے سے، درخواست گزار--زنجیرہ کی بیگم صاحبہ---کے ساتھ سخت ناانصافی ہوئی ہے۔ ہزا کسیلنسی اب واحد مقتدر شخصیت ہیں جو اس ناانصافی کو درست کرسکتے ہیں اور چونکہ اس معاملے میں شامل محمڈن لا کا سوال بڑے دوررس نتیجے کا حامل ہے، لہٰذا اگر ہزا کسلینسی چاہتے ہیں تو مقدمہ کے قانونی پہلوؤں کی توضیح کے لئے میں بہ نفس نفیس حاضر ہو جاؤں گا۔ اس سوال کے محتاط مطالعہ کے بعد اب میرے ذہن میں کوئی شک و شبہ نہیں رہا کہ ریاست کی جانب سے طلاق کا وثیقہ پیش کیا گیا ہے وہ محمڈن لا کے شیعہ مکتب فکر کے مطابق یقیناً باطل ہے جس کا اطلاق موجودہ مقدمے پر بہر صورت ہونا چاہئے۔ فاضل وکلاء مثلاً مرحوم سر محمد شفیع اور سر سلطان احمد کے تفصیلی خیالات اس محضر نامے سے منسلک ہیں۔ اگر ہزا کسیلنسی ضروری خیال کرتے ہیں تو میں میں اسلام کے ان صولوں کی مزید تشریح و توضیح کرنے میں خوشی محسوس کروں گا کہ اسلامی قانون شادی بیاہ کے معاملے میں کمزور فریق کو تحفظ فراہم کرتا ہے۔ عملاً یہ اصول بالکل انگلش قانون کی طرح ہے۔ اسلام کے ایک مخصوص فرقہ سے تعلق رکھنے والی ایک مسلم خاتون محض شادی کی بنیاد پر، اپنے شوہر، اگر وہ دوسرے فرقے سے تعلق رکھتا ہے، کے فرقے کے قانون کی مشروط و پابند نہیں ہو جاتی۔ اگر بیوی کو اس طرح اپنی شخصیت اپنے شوہر کی شخصیت میں ضم کرنے کی اجازت دی جاتی تو یہ جبر کی ایک لطیف شکل ہوتی جسے قانونِ اسلام کسی بھی شکل اور صورت میں تسلیم نہیں کرسکتا کیونکہ یہ قرآن کے حکم صریح کے مخالف ہے۔

''دین کے معاملے میں کوئی زور و جبر نہیں'' (قرآن، سورہ ۱۱: ۲۵۷)

یہاں تک کہ اگر ایک یہودی یا عیسائی خاتون کسی مسلم شوہر سے شادی کرتی ہے (حالانکہ یہ شادی محمڈن لا کے مطابق کلی طور پر جائز ہے) تو وہ محمڈن لا کے مطابق اپنے شوہر کے قانون کی مکلف نہیں ہوتی محض اس بنیاد پر کہ اس کا شوہر ایک مسلمان ہے یا اس نے ایک مسلمان سے شادی کی ہے۔ یہ بات تو واضح ہے کہ ایک مخصوص فرقہ سے تعلق رکھنے اور دوسرے فرقے کے ایک مسلم شخص سے شادی کرنے والی عورت کی حالت ان یہودی یا عیسائی عورتوں سے زیادہ ابتر نہیں ہو سکتی جو مسلمان شوہروں سے شادی کرتی ہیں۔ دراصل یہ اصول انصاف، مساوی حقوق اور پاک ضمیر پر مبنی ہے اور اسلام سے مخصوص نہیں ہے۔

اس معاملے کے قانونی پہلوؤں سے قطع نظر، جب اس قضیے کے حقائق واضح طور سے پیش کئے گئے تو منکشف ہوا کہ ہز اکسیلنسی کے درخواست گذار کے ساتھ ان کے شوہر اور ریاست کا سلوک انتہائی غیر منصفانہ تھا۔ حقائق حسب ذیل ہیں:

ا۔ ۱۹۱۴ میں ریاست اور عرض گذار کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا۔ اس معاہدے کے مطابق جو کہ فضیلت مآب لارڈ اینڈ لیڈی وِلنگڈن کی موجودگی میں عمل میں آیا تھا بیگم کو ماہوار نان و نفقہ کے طور پر گارڈ آف آنر کے ساتھ ۳۰۰۰ روپے ریاست کی جانب سے دینا طے پایا گیا تھا اور بیگم کو اپنے قبضے سے چند زیوارت حوالے کرنے تھے۔

۲۔ ۱۹۱۵ میں ایک اور معاہدہ عمل میں آیا جس میں ۱۹۱۴ میں ہونے والے معاہدے میں ترمیم کی گئی۔ اس معاہدہ کی رو سے وہ اپنے نان و نفقہ کے حق سے جس پر کہ ۱۹۱۴ میں اتفاق ہوا تھا دست بردار ہو گئیں۔ ریاست گارڈ آف آنر فراہم کرنے پر متفق رہی جیسا کہ اس نے ۱۹۱۴ میں اتفاق کیا تھا۔ بیگم نے اپنے پاس رکھے ہوئے مزید زیورات حوالے کرنے پر موافقت ظاہر کیا۔

۳۔ انہوں نے مذکورہ بالا معاہدہ کی روشنی میں سرکاری زیورات حوالے کر دیا۔

۴۔ ریاست کی جانب سے، جیسا کہ اتفاق ہوا تھا گارڈ آف آنر پیش کرنے سے

انکار کر دینے کے بعد ۱۹۲۹ میں بیگم، اپنے گارڈ آف آنر کے حق کی بحالی کے لئے، جنجیرہ کورٹ میں ایک مقدمہ دائر کرنے پر مجبور ہوگئیں جس پر ریاست نے یہ دعویٰ کرتے ہوئے پہلی بار طلاق کا وثیقہ پیش کیا کہ اس کی تعمیل ان کے مرحوم شوہر نے ۱۹۲۰ میں کی تھی --- یہ وثیقہ شیعہ قانون کے مطابق بالکلیہ باطل ہے جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں اور موجودہ قضیے میں بہر صورت اس کا اطلاق ہونا چاہئے۔

حقائق اس بات کی واضح تصدیق کرتے ہیں کہ اسٹیٹ اتھارٹیز (ریاستی حکام) نے اس معاملے کو صحیح اور شفاف طریقے سے حل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے بڑی چالاکی سے بیگم کے قبضے میں رکھے زیوارت اپنے قبضے میں کر لئے اور علاوہ ازیں انہیں ان کے نان و نفقہ کے حق سے بھی دست بردار کرا دیا اور صرف گارڈ آف آنر ہی ان کے پاس رہنے دیا۔ یہ ان کے پیشگی منصوبہ بند پلان کا حصہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ کسی صورت گارڈ آف آنر کے دعویٰ پر اصرار کریں تو ان کے چہرے پر ایک غیر قانونی دستاویز اٹھا کر ماردیں اور یہ درخواست کر سکیں کہ 1915 کا معاہدہ بغیر کسی تحقیق و معائنے کے کیا گیا تھا اس لئے قانوناً ناقابل تنفیذ ہے، گویا کہ عرض گذار کے ذریعہ ۳۰۰۰ روپے کے مینٹیننس سے دست برداری بھی فریق ثانی کے لئے لائق اعتنا نہیں کہ وہ بیگم کو گارڈ آف آنر فراہم کرنے پر اتفاق کرتا۔

اس پورے معاملے میں جو بے رحمانہ ناانصافی کی گئی ہے وہ بالکل واضح ہے اور اب جو سوال ہے اور جس کو عملی طور پر حل کرنا ہے وہ وقار کا معاملہ ہے وراثت کا نہیں --- ایک معزز خاندان کی معصوم عورت کا وقار جس کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ ریاست کے وارث کی ماں نہیں بن سکی۔ مجھے ذرہ برابر شک نہیں کہ ہز اکسیلنسی وائسرائے اپنی امتیازی بصیرت کی بنیاد پر ریاست کی جانب سے کھیلے گئے اس غیر منصفانہ کھیل کی تفتیش کریں گے اور ایک عورت کے خلاف جبر و ناانصافی کی تلافی کریں گے جس نے جنجیرہ کے حاکم کو اپنی زندگی کا بہترین حصہ دیا اور جس کی امیدیں اب صرف ہز اکسیلنسی وائسرائے سے وابستہ ہیں۔

آپ کا خیر اندیش

محمد اقبال

Sir Mohd. Iqbal, Kt.
M. A., Ph. D.
Barrister-at-Law.
Lahore.

Lahore,
17th April 1933

My dear Mr. Mieville,

I am writing this to request you to kindly place the enclosed memorial before His Excellency the Viceroy. When I had the privilege of meeting His Excellency a short time ago I drew his attention to some of the more important aspects of the matter; and His Excellency very kindly told me that he would finally decide it about the middle of April by which time His Excellency thought ~~that~~ the Bombay Presidency States would come directly under the Viceroy. The facts are well known to His Excellency, as at one stage of the case their Excellencies Lord and Lady Willingdon took kindly interest in the matter and brought about a settlement between the parties.

I need hardly say that the matter is one of great importance especially because it involves an important point of the family law of Islam a wrong decision of which by the courts of Janjira have caused grave injustice to the petitioner-the Begum Sahiba of

Dr. Sir Mohd. Iqbal, Kt.
M. A., Ph. D.
Barrister-at-Law,
Lahore.

- : 2 : -

Janjira. Since His Excellency is now the only person who can correct this injustice and the question of Mohammadan Law involved is a far reaching one, I shall be ready, if His Excellency so desires, to personally explain the legal aspect of the case to him. After a careful study of the question I have no doubt in my mind that the deed of divorce produced by the State is absolutely invalid according to the Shia School of Mohammadan Law which must apply to the present case. Detailed opinions of such learned lawyers as the late Sir Mohammad Shaffi and Sir Sultan Ahmad are attached to this Memorial. If His Excellency deems it necessary I shall be glad to further explain the principle that the Law of Islam protects the weaker party to the marriage- a principle which is practically the same as in the English Law. A Muslim woman belonging to a particular sect of Islam does not, by the mere fact of marriage, become subject to the law of her husband's sect if he happens to belong to another sect. If the wife is allowed thus to merge her personality into the personality of her husband this will be a subtle form of compulsion which the law of Islam cannot recognize in any shape or form, as it is in direct

Sir Mohd. Iqbal, Kt.
M. A., Ph. D.
Barrister-at-Law,
Lahore.

- : 3 : -

opposition to the express injunction of the Quran:

"No compulsion in matters of religion"
(Qoran Sura II : 257)

Even a Jewish or a Christian woman marrying a Muslim husband (which marriage is perfectly valid according to Mohammadan Law) does not, according to Mohammadan Law, become subject to the Law of her husband by the mere fact of marrying a Muslim husband. It is obvious that the position of a Muslim woman belonging to a particular sect and marrying a Muslim husband belonging to another sect cannot be worse than the position of a Jewish or a Christian woman marrying a Muslim husband. Indeed this principle is based on justice, equity and good conscience and is not peculiar to Islam.

Apart from the legal aspect of the matter the facts of the case when clearly stated, show how unjustly His Excellency's petitioner has been treated by her husband and the State. The facts are:-

1. In 1914 there was an agreement between the State and the Memorialist. According to this agreement which was arrived at in the presence of their Excellencies Lord & Lady Willingdon the Begum was allowed Rs.3000/- monthly as maintenance

Sir Mohd. Iqbal, Kt.
M. A., Ph. D.
Barrister-at-Law,
Lahore.

- : 4 ; -

allowance with a guard of honour to be provided by the State, and was required to surrender certain jewellery in her possession.

2. In 1915 there was another agreement which modified the agreement of 1914. According to this agreement she relinquished her right to the maintenance allowance as agreed in 1914, the State agreeing to provide the guard of honour as agreed in the same year. She further agreed to surrender the jewellery in her possession.

3. She surrendered the State Jewellery in accordance with the above agreement.

4. The state having refused to pay for the guards of honour as agreed the Begum was driven in 1929 to file a suit in the Janjira Court for the establishment of her right to the guard of honour. Thereupon the State produced for the first time a deed of divorce purported to have been executed by her late husband in 1920-a deed absolutely invalid according to Shia Law which, as I have submitted before, must apply in the present case.

Dr. Sir Mohd. Iqbal, Kt.
M. A., Ph. D.
Barrister-at-Law,
Lahore.

- : 5 : -

The facts thus stated clearly show that the State Authorities never handled the matter with clean hands. They cleverly managed to get possession of the Jewellery in the possession of the Begum, and further got her to relinquish her right to the maintenance allowance, leaving her only the guard of honour. It seems a part of their premeditated plan to hurl at her face an illegal document in case she insisted on her claim to the guard of honour, and to plead that the agreement of 1915 was without consideration and hence unenforceable at law, as though the relinquishment of Rs.3000/- by the petitioner was not a consideration for the other party to agree to providing the guard of honour to the Begum.

The pitiless injustice of the whole plan is quite clear, and since the question now to be settled is practically one of dignity only and not one of inheritance-dignity of an innocent lady of a respectable family whose only fault was that she did not become the mother of an heir to State, I have not the least doubt that His Excellency the Viceroy, with his characteristic insight,

Dr. Sir Mohd. Iqbal, Kt.
M. A., Ph. D.
Barrister-at-Law,
Lahore.

- : 6 : -

will see through the iniquitous game played by the State authorities, and correct the wrong thereby done to a lady who gave the best part of her life to the ruler of Janjira, and whose only hope now lies in His Excellency the Viceroy.

Yours sincerely,
Mohammad Iqbal

ترانۂ ہندی کے سو سال

اردو زبان ہندوستان کی ایک ممتاز زبان ہے جو نہ صرف یہاں کی مشترکہ تہذیب کی علامت ہے بلکہ کل ہند زبان کی حیثیت سے مختلف علاقوں میں رابطہ کا کام بھی کرتی رہی ہے اور آج کے بدلے ہوئے سیاسی اور لسانی منظر نامہ میں وہ آج بھی رابطہ کا کام کر رہی ہے۔ یہ اردو ہی ہے جس نے ہماری قومی زبان ''ہندی'' کے لیے ملک کے طول و عرض میں پھیلنے کے لئے راہیں ہموار کی ہیں۔

اردو ہندوستان میں جنمی اور اس تہذیب سے جڑی رہی۔ حب الوطنی اس کے سرشت کا حصہ ہے۔ دنیا کی ہر زبان کی شاعری کے تین موضوعات بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ عورت کی محبت، مذہب سے محبت اور اپنے وطن سے محبت۔ انھیں تین عناصر سے دنیا کی شاعری بنی اور سنوری ہے۔ وطن کی محبت بھی اردو شاعری کا اہم موضوع رہا ہے۔ قطب شاہی عہد میں جب دکن کی آزادانہ حیثیت تھی، دکن سے محبت کا اظہار ملتا ہے۔

ہندوستان جب متحد ہوا اور ایک ملک بنا تو سارا ہندوستان اردو شعراء کے لئے موضوعِ

سخن بنا اور جدید اردو شاعری میں جب بطور خاص فرنگی تسلط کے خلاف ردعمل کے طور پر حب الوطنی سے سرشار نغمے الاپے گئے، حالی اور محمد حسین آزاد نے انیسویں صدی کے ربع آخر میں حب وطن سے سرشار ہوکر وطن کے گیت گائے، یہ لئے بیسویں صدی کی ابتدا میں تیز سے تیز ہوتی گئی اور اردو کے تقریباً ہر شاعر نے وطن کے محبت کے بارے میں نظمیں کہیں۔ چکبست کی شاعری اس ضمن میں اس لحاظ سے منفرد ہے کہ ان کی شاعری کا موضوع صرف حب الوطنی سے عبارت ہے۔ مشہور مستشرق جرمن اسکالر انمری شمل نے چکبست کو بجا طور پر اردو کا خالص ''محب وطن'' شاعر کہا ہے۔ اقبال بھی اسی زمانے میں آسمانِ شاعری پر ابھرے اور دیگر موضوعات کے ساتھ جس میں فلسفہ وفکر اور اعلیٰ تاریخی شعور اور جمالیاتی اور جمالیاتی فضا تھی، وہ بھی حب وطن سے سرشار ہوئے۔ انیسویں صدی کا نصف آخر اور بیسویں صدی کا نصف اول ہندوستان کی سیاسی اور سماجی تاریخ میں کئی لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے۔ انگریزی سامراج کے علاوہ یہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب میں منافرت، جنگ وجدل، شکوک وشبہات کا بھی دور تھا اور ہندو اور مسلمان آپسی ٹکراؤ کے دہانے پر کھڑے کردیے گئے تھے، یہ انگریز سامراج کی پالیسی کا حصہ تھا۔ یہ اسی کا ردعمل تھا کہ اقبال نے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب، ہندو مسلم بھائی چارے کی سالہا سال کی مضبوط روایت اور اپنے گہرے تاریخی شعور سے مغلوب ہوکر ۱۹۰۴ء میں ''ترانہ ہندی'' لکھا۔ ''ترانہ ہندی'' ابتدا میں ''میرا دیس'' کے عنوان کے تحت لکھا گیا اور لاہور سے نکلنے والے رسالے ''مخزن'' میں شائع ہوا۔ اپنی نغمگی، آہستہ اور سحر انگیز موسیقی، فکر کی بالیدگی اور ہندوستانی تہذیبی تاریخ کے سیاق میں ''میرا دیس'' یعنی ''ترانہ ہندی'' ہر ہندوستانی کے دل کی دھڑکن بن گیا۔ اس گیت کے بعد اقبال کی شاعری کا موضوع وسیع تر ہوتا گیا۔ لیکن وطن کی محبت کا جذبہ ان کی موت سے قبل تک ان کی شاعری کا موضوع بنا رہا۔ ''بانگِ درا'' کی نظمیں ''ہمالہ''، ''تصویر درد''، ہندوستانی بچوں کا گیت اس کی صرف چند مثالیں ہیں۔ حب وطن مستِ خواب نہیں رہ سکتا، اس کا اظہار ضروری ہے۔ اور اقبال نے اس جذبۂ وطن پرستی کا کیا بلیغ شاعرانہ اظہار کیا ہے۔

''ترانہ ہندی'' کے بارے میں کئی طرح کی رائیں پیش کی گئی ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱۔ رسالہ اتحاد، لکھنؤ میں لکھا گیا ہے کہ نظم ''ہمارا دیس'' لاہور کے مشہور رسالے مخزن جلد ۸، شمارہ ۱/۱ اکتوبر ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی۔

۲۔ اس کی تصحیح ہمارے کئی محققین نے کی ہے۔ جن میں عبداللطیف اعظمی، محمد عمر نور الہی اور ڈاکٹر گیان چند شامل ہیں۔ اور سبھی اس بات پر متفق ہیں کہ یہ نظم رسالہ مخزن لاہور میں ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی۔ اولاً یہ نظم زمانہ کانپور میں ستمبر ۱۹۰۴ء میں شایع ہوئی اور پھر دوبارہ

....

''ترانۂ ہندی'' کے لکھے جانے کی تاریخ بہت دلچسپ ہے۔ اقبال ۱۹۰۴ء میں گورنمنٹ کالج، لاہور میں لکچرر تھے۔ اور مشہور محبِّ وطن لالہ ہردیال یہاں اقبال کے چہیتے شاگرد تھے۔ اس زمانے میں لاہور میں ینگ مینس کرسچن ایسوسی ایشن (YMCA) قائم تھی جس کے لالہ ہردیال بھی ایک ممبر تھے۔ یہاں کسی معاملے میں ان کا کلب کے سکریٹری سے اختلاف ہوگیا، چنانچہ لالہ ہردیال نے ایک نئی انجمن ینگ مینس انڈین اسوی ایشن (Young Men's Indian Association) قائم کی اور اس کے افتتاحی جلسے کا اہتمام کیا گیا۔ جس دن یہ جلسہ ہونا تھا، اسی روز دوپہر ۳/بجے اقبال سے درخواست کی گئی کہ وہ اس بزم کے افتتاحی جلسے کی صدارت کریں، جسے اقبال نے منظور کیا۔ جب شام ۶/بجے جلسہ ہوا تو اقبال نے کسی قسم کی صدارتی تقریر کرنے کے بجائے ترنم سے اپنی یہ نظم سنائی جسے جناب محمد عمر نور الہی نے پنسل سے لکھ کر مولانا عبدالحلیم شرر کے رسالہ اتحاد میں اشاعت کے لئے بھیج دی۔ جب یہ نظم شائع ہوئی تو مولانا حسرت موہانی نے اس نظم کی زبان و بیان پر تنقید کی۔ جب مولانا حسرت موہانی کا یہ تبصرہ اقبال کی نظر سے گزرا تو اقبال بہت ناراض ہوئے۔ یہ دراصل نظم کے غلط لکھے جانے کا نتیجہ تھا۔

ینگ مینس اسوسی ایشن کے جلسے میں اقبال نے یہ نظم ترنم سے سنائی جس کا حاضرین پر بہت اچھا اثر ہوا۔ یہ نظم جلسہ کے ابتدا اور اس کے آخر میں ترنم کے ساتھ سنائی گئی۔ اس سے شرکاء کا مقصد ہندوستان میں اتحاد اور قومی یکجہتی پیدا کرنا تھا۔

یہ نظم رسالہ ''مخزن'' لاہور اور پھر کانپور سے شائع ہونے والے رسالے ''زمانہ'' میں

بھی ستمبر ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی۔ محمد عمر نور الٰہی (مصنف ناٹک ساگر) نے اس نظم کی شانِ نزول پر مضمون لکھا جس کا عنوان تھا ''ہندوستان ہمارا کی شانِ نزول'' جس کی تلخیص کا پہلے ذکر آچکا ہے۔ یہ مضمون رسالہ ''آج کل'' کے یکم جنوری ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ نظم اتحاد، زمانہ، مخزن اور دیگر رسالوں میں شائع ہوئی۔ اس نظم کی زبان پر جو بھی اعتراضات کیے گئے اقبال نے علمی انداز اور وقار کے ساتھ انہیں قبول کیا اور اسکی اصلاح کرتے رہے۔ اقبال کی اس نظم کی تحریر کا جو عکس ہے وہ ۱۰/اگست ۱۹۰۴ء کا ہے۔ یہ عکس رسالہ آج کل، دلی کے اقبال نمبر (۱۹۷۷ء) کے سرِ ورق پر شائع ہوا تھا اور یہ متن ابتدائی مطبوعہ نظم کا اصلاح شدہ متن ہے۔ اقبال کی یہ شہرہ آفاق نظم ان کے مجموعہ کلام ''بانگِ درا'' میں ''ترانہ ہندی'' کے نام سے شائع ہوئی۔

ترانۂ ہندی جو ۱۹۰۴ء میں لکھی گئی، اقبال کے بھرپور تاریخی شعور، قومی زندگی کی اعلیٰ اقدار، آپسی بھائی چارہ، محبت اور امن وسلامتی کی مظہر ہے جو اقبال کا پیغام رہا ہے۔ اس نظم نے ہمارے قومی شعور کو جگانے اور وطن پرستی کے جذبے کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ یہ نظم بچوں کے صبح کے ترانے کی حیثیت سے اسکول اور کالجوں میں گائی جاتی رہی اور آج بھی گائی جاتی ہے۔ اقبال نے اس نظم میں جس شدت سے قومی شعور اور احساس کو پیش کیا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔ اقبال کی قومی، وطنی شاعری میں یہ نظم کلیدی نظم کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نظم کی عوام کے دلوں پر حکمرانی رہی ہے، اس نے عوام وخواص میں حب الوطن کے جذبہ کو راسخ کیا اور تحریکِ آزادی کو طاقت بخشی، اس کے میٹھے اور آسان بول لوگوں کے دلوں کو لبھاتے رہے۔ یہ نظم صبح سویرے اسکولوں کے بچوں کی وطن کی محبت کے تئیں ذہن سازی کرتی رہی۔ یہ نظم ہندوستان کی برّی اور بحری فوج کا گیت بھی ہے جو جوانوں میں حوصلہ پیدا کرتا رہا اور آج بھی حوصلہ پیدا کرتا ہے۔

جب راکیش شرما نے ہندوستان کے پہلے خلائی جہاز کا سفر کیا اور جب وہ جہاز ہندوستان پر سے گزرا تو اس وقت کی ہماری وزیر اعظم اندرا گاندھی کے پوچھنے پر آپ کو خلائی جہاز سے ہندوستان کیسا لگ رہا ہے، راکیش شرما نے جواب دیا ''سارے جہاں سے

اچھا ہندوستاں ہمارا'' صحیح ہے ''دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے'' اس کی زبان اور اس نظم کا شاعرانہ حسن دلوں میں اتر جاتا ہے۔ اس نظم کا جادو دوسری بہت ساری نظموں پر بھاری ہے ۔ ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے سارے رہنما اس نظم کو عزیز رکھتے تھے اور اس نظم کے بامعنی شعر اور اس کے حسن کو اپنے مقاصد کے حصول میں استعمال کرتے تھے۔ فرقہ وارانہ فسادات اور مناقشات کے مواقع پر گاندھی جی جہاں کہیں جاتے اس نظم کے اشعار کو دلوں اور ذہنوں کو صاف کرنے کے لئے استعمال کرتے تھے، خاص طور سے یہ شعر

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا　　　ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

یہ شعر گاندھی جی کی امن یاترا کا بنیادی منتر تھا۔

اقبال کا یہ ''ترانۂ ہندی'' زبان زدِ خاص و عام ہے، پارلیمنٹ میں، اسمبلیوں میں اکثر یہ نغمہ گونجتا رہتا ہے اور ہمارے وزرائے اعظم وطن سے اظہارِ محبت کے لئے اسے دہراتے رہتے ہیں۔ ۱۹۳۸ء میں اقبال کے انتقال کے بعد جامعہ ملیہ سے شائع ہونے والے رسالہ ''جوہر'' کے ایڈیٹر نے خصوصی اشاعت ''اقبال نمبر'' شائع کیا تو اس کے ایڈیٹر جناب محمد حسین نے گاندھی جی کو خط لکھا اور ان سے ''جوہر'' کے اقبال نمبر کے لئے پیغام کی فرمائش کی۔ گاندھی نے جو اس وقت وردھا میں تھے اپنے جوابی خط میں لکھا:

''بھائی محمد حسین

آپ کا خط ملا۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم کے بارے میں کیا لکھوں؟ لیکن اتنا تو میں کہہ سکتا ہوں کہ جب ان کی مشہور نظم ''ہندوستاں ہمارا'' پڑھی تو میرا دل اُبھر آیا اور بروڈہ جیل میں تو سینکڑوں بار میں نے اس نظم کو گایا ہوگا۔ اس نظم کے الفاظ مجھے بہت ہی میٹھے لگے اور یہ خط لکھتا ہوں تب بھی وہ نظم میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔

آپ کا

م.ک. گاندھی

انیسویں صدی کے ربع آخر میں ملک کی قومی زبان کے تعلق سے ایک تنازعہ کھڑا ہوا۔ اس تنازعہ نے شدت اختیار کی تو گاندھی جی نے اس مسئلہ کے حل کے طور پر ''آسان اور سرل

بول چال کی زبان ''ہندوستانی'' کا نظریہ پیش کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ قومی زبان ایسی ہونی چاہیے جس میں سنسکرت یا عربی فارسی کے زیادہ لفظ نہ ہوں اور اتری ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی عام بول چال پر مشتمل زبان کو رواج دیا جائے۔ وہ ہندوستانی کو اردو + ہندی = ہندوستانی کہتے تھے۔ وہ اقبال کی شاعری کو پسند کرتے تھے، خاص طور پر ترانۂ ہندی انھیں پسند تھا اور اسے وہ ہندوستانی نمونہ سمجھتے تھے۔ ۲۵ رجنوری ۱۹۴۸ء کو راشٹر بھاشا کے مسئلہ پر لکھتے ہوئے انھوں نے ہریجن میں لکھا:

''میں اس نظم کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں، ہندی، ہندوستانی یا اردو؟ ممکن ہے میں اپنے وچاروں میں اکیلا ہوں گا۔ مگر یہ بات صاف ہے کہ یہ نہ سنسکرت مشرت ہندی ہے نہ فارسی آمیز اردو۔ یہ صرف ہندوستانی ہے جس کی آخر کار جیت ہونے والی ہے۔''

اقبال کی دوسری نظموں مثلاً ہندوستانی بچوں کا گیت، ہمالہ، نیا شوالہ اور انکی ۱۹۳۷ء میں لکھی گئی نظم ''شعاعِ امید'' میں بھی ان کی حب الوطنی کا جذبہ کارفرما ہے۔ اس نظم کے صرف دو شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب

ہندوستان کا غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہنا، انھیں خواب سے بیدار کرنا اور مشکل حالات سے انھیں نکالنا اقبال کی زندگی کا مقصد تھا۔ اور اس کے حصول کے لئے انھوں نے اسے اپنے اشکوں سے سیراب کیا۔ اقبال کی حب الوطنی کا جذبہ اس طرح کی دیگر کئی نظموں میں پوشیدہ ہے اور بین السطور میں ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' کی زیریں لہر پائی جاتی ہے۔ ترانۂ ہندی ایک طرح سے قومی اور وطنی شاعری کا تاج محل ہے اور اس کے حسن اور لفظوں کی دلپذیری اور رواں موسیقیت سے قاری اور سامع دونوں لطف اندوز ہوتے ہیں۔

اقبال کو خالقِ پاکستان کہا جاتا ہے۔ ۱۹۳۱ء کا مسلم لیگ کا وہ خطبہ جو انھوں نے الہ آباد

میں دیا اسے ان کے نظریہ پاکستان کی بنیاد کہا جاتا ہے۔ اس رائے سے من وعن اتفاق کرنا مشکل ہے۔

ایک محبِّ وطن شاعر کا اپنا ایک سیاسی نظریہ ہوسکتا ہے، لیکن پاکستان کی جو موجودہ صورت ہے وہ ان کے تصور سے میل نہیں کھاتی، چنانچہ اقبال نے اپنے اس تصور کی وضاحت ۱۹۳۴ء میں راغب حسین کے نام ایک خط میں کی ہے۔ اقبال راغب حسین کے جو مسلم لیگ کے ایک ممتاز لیڈر تھے، اپنے خط مورخہ ۶ رمارچ ۱۹۳۴ء کو مشہور انگریزی ادیب Edward Thompson کے حوالے سے جنھوں نے اقبال کی کتاب پر تبصرہ کیا تھا، لکھتے ہیں:

"Please also note that the author of this review confuses my scheme with "Pakistan" , I propose to create Muslim Province within the Indian Fedration, the Pakistan scheme proposes a seprate federation of Muslim provinces in the north-west of India outside the Indian federation and directly related to England"

یہ ایک اہم خط ہے جو ان کی ہندوستان کے تئیں محبت کی ایک مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے اور جس کا موجودہ پاکستان کے تصور سے کوئی تعلق نہیں جس کا الزام ان پر دھرا جاتا ہے۔

اقبال ایک فلسفی شاعر تھے جنھوں نے اپنی شاعری میں زندگی اور موت، حرکت وعمل، عشق اور عقل جیسے متنوع موضوعات کو پیش کیا ہے۔ وہ مشرق اور مغرب کے فلسفوں سے برابر استفادہ کرتے رہے ہیں۔ محی الدین ابن عربی، عراقی، اور رومی اور قرآن کریم سے انہوں نے استفادہ کیا ہے، ساتھ ہی وہ ہندوستان کے فکروفلسفہ، رشی منی، ویدوا پنشد اور کشمیری شیواز سے بھی متاثر ہوئے ہیں اور ان فلسفوں سے یا فکری روایات سے بھی استفادہ کیا ہے۔ گرونانک، سوامی رام تیرتھ پر ان کی نظمیں اس ضمن میں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ انھوں نے قرآن اور حدیث سے استفادہ کیا ہے، وہیں انھوں نے گایتری منتر کا بھی اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ وہ بھرتری ہری کے افکار سے بھی متاثر ہیں اور ان کی شاعری کے سوز اور حکیمانہ افکار سے اپنی شاعری میں استفادہ کرتے ہیں۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ وہ ''گیتا'' کا اردو میں ترجمہ کرتے ، وہ ''گیتا'' کی تعلیمات سے بے طرح متاثر تھے اور چاہتے تھے کہ یہ شہ پارہ اردو میں منتقل

ہو۔ گیتا کے اردو میں پچاس سے زائد ترجمے موجود ہیں لیکن اگر اقبال اس کا ترجمہ کرنے میں کامیاب ہوتے تو یہ ترجمہ ''چیزے دیگر است'' کے مصداق ہوتا۔

۱۹۳۲ء میں دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں اقبال بھی شریک تھے۔ اس وقت لندن میں ان کے اعزاز میں ایک تہنیتی جلسہ کا اہتمام کیا گیا تھا، جس کی صدارت اقبال کے دوست سر عبدالقادر نے کی تھی۔ اس موقع پر گول میز کانفرنس کے بیشتر مندوبین اس تہنیتی جلسہ میں شریک تھے۔ اس موقع پر اقبال کی دوست ''سروجنی نائیڈو'' نے اقبال کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ اقبال صرف اردو یا ہندوستان کا عظیم شاعر نہیں ہے بلکہ وہ ''ایشیا کا ملک الشعراء'' ہے۔ ہم آج اردو اور فارسی ہی کے نہیں بلکہ ایشیا کے ملک الشعراء کی یاد تازہ کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں جن کے ''ترانۂ ہندی'' کو سو سال کا عرصہ بیت چکا ہے۔ آج کا یہ جلسہ اقبال اور ترانۂ ہندی دونوں کا جشن ہے۔

تقسیمِ ہند کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے حالات کشیدہ رہے ہیں، اب ان دونوں ملکوں میں امن اور دوستی کے لئے کوششیں ہو رہی ہیں، یہ ایک نیک فال ہے، اس ضمن میں اقبال کی شاعری ہمارے دونوں ملکوں میں محبت، آشتی اور امن کی ایک علامت ہے، اقبال کی شخصیت اور شاعری ان دونوں ملکوں کے عوام کے دلوں کو جوڑنے کا کام کرتی ہے۔ اقبال ان دونوں ملکوں میں تہذیبی و فکری پیغامبر اور factorConnecting ہیں اور ترانۂ ہندی اس ضمن میں رہنمایانہ حیثیت رکھتی ہے، جس کے سو سال کا آج ہم جشن منا رہے ہیں۔[1]

---

[1] اقبال کے ترانۂ ہندی کا جشن راقم الحروف نے شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی کے اشتراک سے منایا تھا، اس جشن کی خبر انگریزی روزنامہ ''ٹائمز آف انڈیا'' کے صفحہ اوّل پر بمبئی کے علاوہ، دلی، حیدرآباد، بنگلور، مدراس اور احمد آباد کے ایڈیشنوں میں بھی شائع ہوئی۔ ممبئی کے اس جشن کے بعد کلکتہ اور بنگلور میں بھی جشن منائے گئے۔ راقم کو بالخصوص بنگلور میں اس جشن میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ ہندوستان کے خلاباز راکیش شرما اور کرناٹک کے وزیر اعلیٰ دھرم سنگھ بھی اس جشن میں شریک تھے۔ بنگلور کا یہ جشن کرناٹک اردو اکیڈمی کے قابل صدر پروفیسر محمد نورالدین سعید کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

ترانۂ ہندی بخطِ اقبال

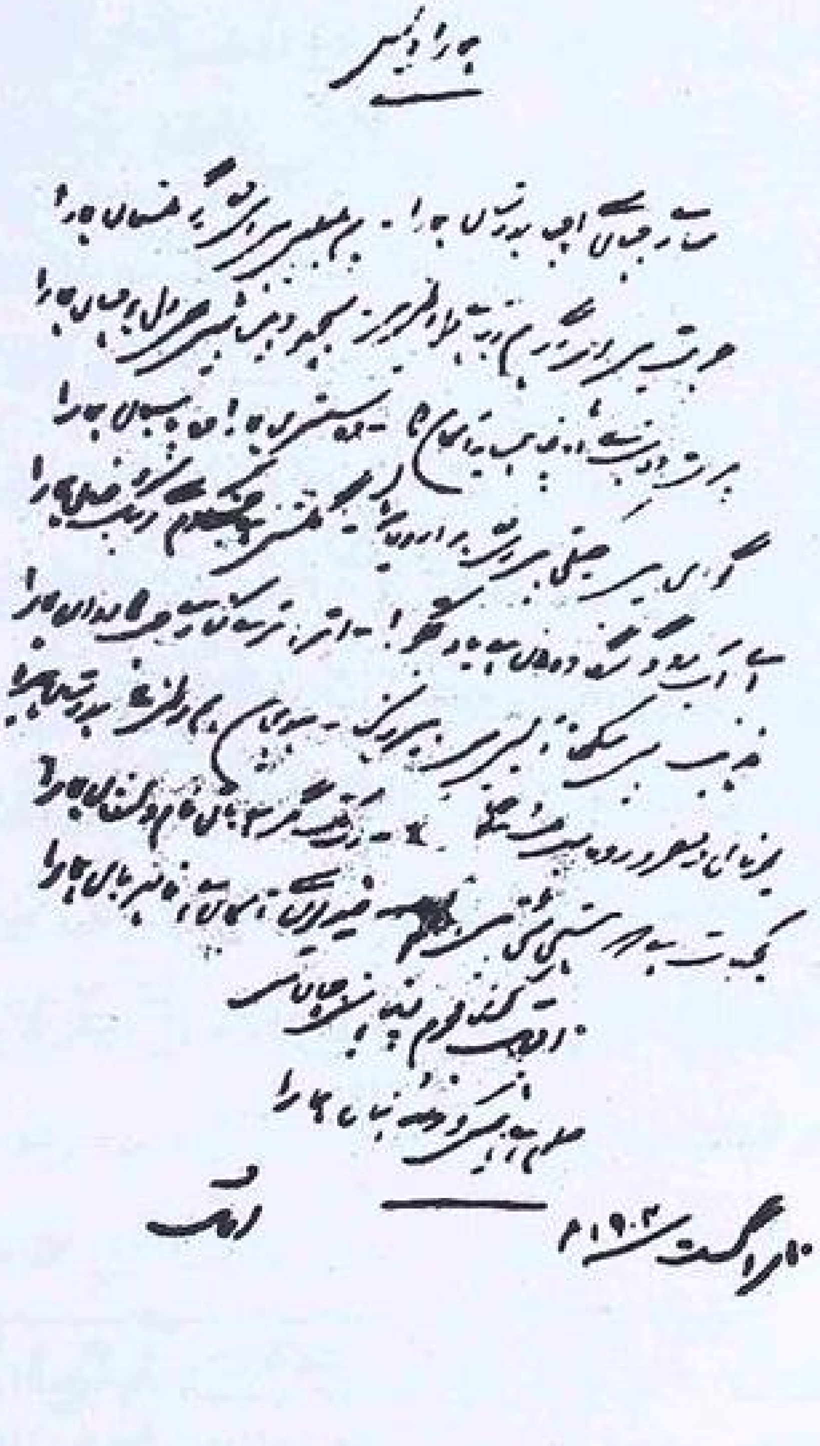

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ۔ ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں ۔ سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا ۔ وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا

گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں ۔ گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا

اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو ۔ اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا ۔ ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے ۔ اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری ۔ صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں

معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

۱۰ راگست ۱۹۰۴ء

مہاتما گاندھی اردو اور اقبال

گاندھی جی جدید ہندوستان کی ایک عبقری شخصیت تھے۔ انھوں نے ہندوستان کو نہ صرف سیاسی غلامی سے آزادی دلائی بلکہ سماجی اعتبار سے اسے بلند کرنے اور معاشی اعتبار سے اسے اپنے قدموں پر کھڑے ہو کر مستحکم ہونے کے اصول اور قواعد بتائے۔ وہ نئے ہندوستان کے نجات دہندہ تھے جنہوں نے اپنے ملک کی سالمیت اور وحدت میں ایک منفرد کردار عطا کیا اور زندگی کی مختلف اور متنوع سطحوں پر اسے صحت مند عناصر سے لیس کیا۔ سماجی اونچ نیچ، فرقہ واریت، مذہبی رواداری اور لسانی وحدت اور دیگر مذاہب کے تعلق سے مثبت اور حقیقت پسندانہ رویہ اپنائے رکھا اور احترام آدم کے بنیادی مقصد کو اپنی شدید مذہبیت کی بھینٹ نہیں چڑھنے دیا۔ انھوں نے ایک طرف ہریجنوں کی چارہ سازی کی تو دوسری طرف دیگر اقلیتوں میں بھی اپنے تئیں اعتماد پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وہ علاقائی اعتبار سے گجراتی تھے۔ مگر انھوں نے اپنے گجراتی نژاد ہونے اور اپنے علاقہ سے محبت کے باوجود جو ایک فطری جذبہ ہے علاقائیت سے بلند ہو کر قومی وحدت کو اپنا مطمح نظر بنائے رکھا یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی کی شخصیت ہندوستان گیر شخصیت ہوگئی اور جسے ساری قوم نے ''باپو'' کے لقب سے پہچانا۔ وہ اعلیٰ

اخلاق اور بلند انسانی اقدار کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔

گاندھی جی کے ہندوستانی سیاست کے افق پر نمودار ہونے سے قبل اردو کے خلاف تحریک شروع ہو چکی تھی۔ جو واقعتاً سارے ہندوستان کے لئے رابطہ اور اتحاد کی زبان تھی۔ نئی ہندی نے جو ابھی نوخیز تھی، فرقہ وارانہ اثرات کے تحت اردو کے مقابلے میں اپنا مقدمہ پیش کیا تھا۔ اردو اور ہندی میں یہ تنازعہ لسانی اعتبار سے قومی وحدت کے لئے ایک بہت بڑا چیلنج تھا، گاندھی جی نے اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے اردو اور ہندی کے لئے عزت واحترام کے تحت قومی زبان کی حیثیت سے ''ہندستانی'' کا نظریہ پیش کیا۔ جو اردو اور ہندی کے امتزاج کا خوشگوار اور خوبصورت نتیجہ تھی۔ اور جو ہندو اور مسلمان دونوں بولتے تھے اور سمجھتے تھے۔ گاندھی جی کا ہندستانی کا نظریہ جو اردو اور ہندی کے ملے جلے روپ سے عبارت ہے۔ اردو اور ہندی کی نفی نہیں کرتا۔ بلکہ ان دونوں زبانوں کو ہندستانی کی پالنے والی بھاشائیں قرار دیتا ہے۔ ہندستانی، اردو اور ہندی کی نفی نہیں کرتی بلکہ ان دونوں سے طاقت حاصل کرتی ہے۔ اپنے ہندستانی کے اس نظریہ کے تحت جو آج بھی ہندوستان کے لسانی مسئلہ کا واحد حل ہے، گاندھی جی نے نہ صرف اردو اور ہندی کے ادبی اسالیب کو قبول کیا بلکہ اسی کے ساتھ ہندستانی کے لئے اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخط تجویز کئے اور اس بات کی تلقین کی کہ ہندستانی کے تعلق سے یہ دونوں رسم الخط سیکھے جائیں۔ انھوں نے کہا تھا:

''ہماری قوم پرستی اگر دونوں رسم الخط سیکھنے سے گھبراتی ہے تو وہ بہت ہی ادنیٰ قسم کی قوم پرستی ہے۔''

گاندھی جی ہندستانی کے تعلق سے اردو اور ہندی کی تہذیبی اہمیت سے واقف تھے اور اسی لئے ان دونوں زبانوں اور ادبی اسالیب کو ہندستانی کا ایک لازمی جز سمجھتے تھے۔ انھوں نے جب ہندستانی کے تعلق سے اردو اور ہندی کی وکالت کی تو اس کو سب سے پہلے عملی اعتبار سے خود اپنایا۔ گجراتی کے رشتے جو گاندھی جی کی مادری زبان تھی ان کے لئے ہندی سیکھنا نسبتاً آسان تھا۔ تاہم انھوں نے اردو کو جو علاقائی اثرات کے تحت عام بول چال کی بین ریاستی زبان تھی۔ اس کے نسبتاً مشکل رسم خط کو بھی سیکھا، بلکہ اپنے ساتھیوں میں بھی اس خوبصورت

زبان کو سیکھنے کا جذبہ پیدا کیا۔ اور اس کے ادب سے بھی آشنا ہوئے۔ چنانچہ انھوں نے اردو زبان کو جس کا حاصل کرنا وہ قومی زبان کے تعلق سے ضروری سمجھتے تھے۔ اور جس کے نہ جاننے کو ادنیٰ قسم کی قوم پرستی پر محمول کرتے تھے۔ وہ حسب موقع اپنے اردوداں احباب سے اردو میں خط و کتابت بھی کرتے تھے۔

گاندھی جی نے نہ صرف اردو سیکھی تھی بلکہ اس میں اس قدر استعداد پیدا کر لی تھی کہ وہ دوسروں کو بھی اردو سکھائیں۔ انھوں نے اپنی اردودانی کے تعلق سے اپنی خودنوشت ''تلاش حق'' میں لکھا ہے:

''میں تامل اور اردو پڑھاتا تھا، جس میں تامل میں نے خود دورانِ سفر اور جیل میں پوپ کی معروف کتاب ''معلم تامل'' کے ذریعہ سیکھی۔ اردو رسم خط بھی کسی حد تک دوران سفر ہی سیکھا تھا۔ زبان کی معلومات مسلمان دوستوں کے ساتھ سیکھے ہوئے عربی فارسی الفاظ تک محدود تھی''۔ اپنی اردودانی کے تعلق سے گاندھی جی پھر لکھتے ہیں کہ:

''مسلمان لڑکوں کو اردو سکھانا نسبتاً آسان تھا اس لئے کہ وہ اردو رسم خط سے واقف تھے اور ان کا کام صرف اتنا تھا کہ وہ لڑکوں میں اردو پڑھنے کا ذوق و شوق پیدا کریں اور ان کی تحریر درست کر دیا کریں۔''

گاندھی جی میں اردو لکھنے پڑھنے کی اچھی صلاحیت تھی اور حسب ضرورت وہ اردو میں تقریر کرتے تھے۔ گاندھی جی کی اردو سے واقفیت اور ان کی لسانی سرمایہ سے آگہی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے ایک دوست کو جو ہندی سے واقف تھے اردو سیکھنے کا شوق دلاتے ہوئے لکھا تھا:

''تم تھوڑی سی ہندی سے واقفیت رکھتے ہو، لہٰذا اردو آسانی سے سیکھ سکتے ہو، فارسی رسم خط کا سیکھنا بہت آسان ہے۔ اس کی ۳۷ آوازوں کے بنیادی حروف بہت تھوڑے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ان حروف کو جوڑنا نسبتاً مشکل ہے۔ لیکن حروف تہجی اور ان کو جوڑنے کا طریقہ سمجھنے کیلئے زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ درکار ہوگا۔ اگر تم روزانہ ایک گھنٹہ دو، اس کے بعد اگر تم ہر روز آدھ گھنٹہ بھی اس کی مشق کرو گے تو چھ مہینے کے اندر اپنا کام چلانے کی حد

تک اردو سیکھ لو گے۔''

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے گاندھی جی اردو تحریر میں اظہار خیال کر سکتے تھے۔ اور اپنے دوستوں اور احباب کے ساتھ زبان کے تعلق سے انتہائی متوازن رویہ رکھتے تھے۔ چنانچہ اپنے نہ صرف اردو جاننے والے دوستوں سے بلکہ انگریزی داں احباب سے بھی جن کی مادری زبان اردو ہوتی، اردو میں خط وکتابت کرتے تھے۔ وہ اردو میں خط وکتابت یا خود کرتے یا کسی اردو جاننے والے کی مدد حاصل کرتے اور پھر خود اردو میں اس پر دستخط کرتے۔ نواکھالی کی یادداشت میں منو بہن گاندھی نے لکھا ہے کہ گاندھی جی نے صبح کی پرارتھنا کے بعد گرم پانی میں تھوڑا سا شہد اور اناس کا رس پیا اور رسول الرحمن انصاری وغیرہ کے نام ہنر بھائی سے اردو میں خط لکھوائے اور خود ہی ان پر اردو میں دستخط کیے۔ زہرہ انصاری، مشہور رہنما اور صحافی جناب عبداللہ بریلوی، مولوی عبدالحق اور دیگر اکابرین کے نام بھی گاندھی جی کے اردو خط محفوظ ہیں۔ اس سلسلہ کا ایک یادگار خط مولوی عبدالحق کے نام ہے۔ ۱۹۲۹ء میں ''کل ہند اردو کانفرنس'' (دہلی) کے موقع پر گاندھی جی بھی کانفرنس میں مدعو تھے۔ مگر اپنی مصروفیات کی وجہ سے وہ شریک کانفرنس نہ ہو سکے۔ لہٰذا انھوں نے ایک خط کے ذریعہ اردو کے تعلق سے اپنا پیغام اور نیک خواہشات مولوی عبدالحق کے نام روانہ کیں۔ جب گاندھی جی کا یہ پیغام جو انھوں نے خود اپنے ہاتھوں سے اردو رسم الخط میں لکھا تھا، شرکاء کے سامنے پڑھ کر سنایا گیا تو حاضرے نے پرجوش طریقے پر اس کا استقبال کیا۔ گاندھی جی کا یہ پیام حسب ذیل ہے۔[1]

بھائی صاحب۔

آپ کا تار ملا، مجھے دکھ ہے کہ آپ کے جلسے میں حاضر نہیں ہوسکتا ہوں۔ میری امید ہے کہ جلسہ ہر طرح کامیاب ہوگا۔ آپ جانتے ہیں کہ میں اردو زبان کی طرقی (ترقی) چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ سب ہندو جو ملک کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ اردو لکھیں اور مسلم

---

[1] کیفیت روداد کل ہند اردو کانفرنس، دہلی منعقدہ، دسمبر ۱۹۲۹ء، ص ۳۵

ہندی سیکھیں۔

سیگاؤں آپ کا

وردھا۲۵ / ۱۲ / ۳۹ گاندھی

گاندھی جی کے اس پیغام سے سامعین میں کافی دلچسپی پیدا ہوئی تو یہ خط ''علمی نمائش گاہ'' میں رکھا گیا تاکہ ہر شخص اسے دیکھ سکے، غالباً اس کا عکس یکم جنوری ۱۹۴۰ء میں ''ہماری زبان'' میں شائع بھی کیا گیا۔[1]

گاندھی جی کو اردو پڑھنے کی بھی خاصی مشق تھی۔ وہ اردو کتابوں کا مطالعہ بھی کرتے تھے۔ چنانچہ رسول اکرم کی سیرت[2] اور صحابہ کے سوانح، یہاں تک کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن بھی گاندھی جی کے زیر مطالعہ رہ چکی ہیں اسی طرح انہیں اردو میں تقریر کرنے پر بھی قدرت حاصل تھی۔ اس سلسلے میں اپنے ایک تجربہ کا انھوں نے اپنی خودنوشت ''تلاشِ حق'' میں ذکر کیا ہے، جس میں انہیں خلافت کمیٹی کے ایک جلسے میں جس میں اکثریت شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کی تھی۔ مولانا حسرت موہانی کے سامنے تقریر کرنا تھی، گاندھی جی لکھتے ہیں:

''میرے لئے یہ بڑی مشکل تھی کہ اپنا مطلب ہندی یا اردو کے مناسب الفاظ میں ادا نہیں کرسکتا تھا، مجھے ایسے مجمع میں جو زیادہ تر شمالی ہندوستان کے مسلمانوں پر مشتمل تھا، مدلل تقریر کرنے کا یہ پہلا اتفاق تھا، میں نے کلکتے کی مسلم لیگ میں اردو میں تقریر کی تھی، مگر وہاں تو صرف الفاظ میں اپنے محبت اور خلوص کا اظہار کردیا تھا، یہاں صورتِ حال دوسری تھی، یہاں مجھے ایسے مجمع کو اپنا زاویۂ نظر سمجھانا اور اپنا ہم خیال بنانا تھا، جس سے مخالفت نہیں تو تنقید کا اندیشہ ضرور تھا، مگر میں نے دل میں سوچا کہ جھینپنے سے کام نہیں چلے گا، میں یہاں اس لئے نہیں آیا ہوں کہ دہلی کے مسلمانوں کی فصیح اور شستہ اردو میں تقریر کروں بلکہ اس لئے کہ ٹوٹی پھوٹی ہندی میں اپنے خیالات ظاہر کروں، چنانچہ میں نے یہی کوشش کی اور اس میں مجھے کامیابی ہوئی۔'' اسی طرح ۲۴ رنومبر ۱۹۱۹ء کو آل انڈیا خلافت کانفرنس میں بھی گاندھی جی نے سامعین

---

[1] ۔ کیفیت روداد کل ہند اردو کانفرنس، دہلی منعقدہ، دسمبر ۱۹۳۹ء، ص ۴۱

[2] ۔ اسوۂ حسنہ کو سمجھنے کے لئے انھوں نے یروڈا جیل میں مولانا شبلی کی سیرۃ النبی بھی پڑھی (بحوالہ مہاتما، جلد دوم) از ڈی۔ جی۔ ٹینڈولکر، ص ۱۴۷،

سے اردو ہی میں خطاب کیا۔[1]

گاندھی جی نے قومی زبان کے تعلق سے ہمیشہ ہندستانی کی وکالت کی۔ وہ ہندستانی کے لئے دیوناگری اور اردو رسم الخط کو اس کا جزو لاینفک سمجھتے تھے، ہندستانی اردو فوجی افسروں کو اردو اور رومن رسم خط پڑھائی جاتی تھی۔ ایک موقع پر یہ تجویز پیش کی گئی کہ ہندستانی کا رسم خط صرف رومن ہو تو گاندھی جی نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ یہ ہندستانی کے لئے خودکشی کا مترادف ہوگا۔[2] یہی نہیں بلکہ انگریزی کے مقابلے میں جب گاندھی جی نے ہندستانی کی تجویز رکھی تب انھوں نے دستاویزات پر دیوناگری اور اردو دونوں رسم خط میں دستخط کئے۔[3] گاندھی جی عرصہ تک ہریجن سیوک شائع کرتے تھے۔ لیکن بعد میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ ہریجن سیوک صرف دیوناگری میں شائع کرکے اس کی اردو اشاعت بند کردینا چاہئے۔ گاندھی جی نے اس تجویز کی بھی مخالفت کی اور کہا کہ اگر اردو ایڈیشن بند کرنا ہے تو دیوناگری ایڈیشن بھی بند کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ ہندستانی کا تصور اردو اور دیوناگری دونوں لکھاوٹوں سے بنتا ہے۔[4]

گاندھی جی کی اردو سے دلچسپی دراصل ان کے قیام افریقہ کی یادگار ہے۔ گاندھی جی کے سوانح نگار ڈی۔ جی۔ ٹینڈولکر D. G. Tendulkar نے لکھا ہے کہ افریقہ میں وہ بچوں کو تھوڑی تامل اور اردو بھی سکھاتے تھے،[5] بعد میں انھوں نے اردو پونے کے یروڈا جیل میں مظفر علی سوختہ سے سیکھی۔ انھوں نے لکھا ہے کہ یروڈا جیل میں جو سات کتابیں ان کے پاس تھیں ان میں سے ایک اردو کا معلم (Urdu Manual) بھی تھا جو انہیں مولانا ابوالکلام آزاد نے دیا تھا۔ جیل میں وہ قرآن، تلسی داس کی رامائن، عیسائیت پر چند کتابوں کے مطالعے

---

[1]۔ تلاشِ حق (جلد دوم)، ص ۳۱۲،

[2]۔ Mahatma : Life of Mohandas Karamchand Gandhi (Vol-II) by : D. G. Tendulkar. Page 330, Mahatma (Vol. III), by D. G. Tandulkar Page. 400

[3]۔ تلاشِ حق (جلد دوم)، ص ۳۱۲

[4]۔ Mahatma : Life of Mohandas Karamchand Gandhi (Vol.II) by D. G. Tendulkar

[5]۔ Page 330, Mahatma (Vol.II) by D. G. Tendulkar Page. 400

میں مصروف رہتے۔اور اردو اسباق کی مشق کرتے۔[1] ۱۸۹۶ء میں جب وہ جنوبی افریقہ سے ہندوستان لوٹ رہے تھے تو اپنے ۲۴ دنوں کے طویل سمندری سفر میں ایک انگریز افسر کے ساتھ تامل اور اردو سیکھ رہے تھے۔[2]

غیر اردو داں حضرات کے لئے اردو کی تدریس کا سب سے بڑا مسئلہ اس کا املا ہے۔ اردو میں کئی ہم صورت آوازیں ہیں جن کے لئے مختلف حروف استعمال ہوتے ہیں۔ہم صوت آوازوں کے لئے مختلف حروف اردو رسم خط اور اردو زبان کی لسانی سماجی لسانیات کا مسئلہ ہے اور ترسیموں (Graphimics) کے لحاظ سے ان ہم آواز اصوات کیلئے مختلف حروف بامعنی بھی ہیں، جن پر مشق کے ذریعہ قابو پایا جاسکتا ہے۔ یہ ہم صوت حروف اردو کی تعلیم میں گاندھی جی کے لئے بھی پریشان کن تھے۔مشہور قومی رہنما ڈاکٹر مختار انصاری کی بیٹی زہرہ انصاری سے گاندھی جی بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ اوران سے اردو میں خط وکتابت بھی کرتے تھے۔گاندھی جی کی اردو تعلیم اور بطور خاص اردو رسم خط کی نزاکتوں کے سلسلے میں وہ خطوط کے ذریعہ زہرہ انصاری سے بھی مشورہ کرتے تھے۔ یروڈہ جیل سے ۲۳/ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو زہرہ انصاری کو لکھتے ہیں کہ:[3]

پیاری بیٹی زہرہ

تمہارے دونوں خط مل گئے ہیں، خدا کی مہربانی سے میری صحت اچھی ہو رہی ہے۔ خدا نے ہی فاقہ کروایا تھا، خدا نے ہی خانہ (کھانا) دیا۔اب ہم سب خدا سے مانگے (مانگیں) کی (کہ) ہندو مسلم کے بیچ بھی ملاپ پیدا کردے۔ جب تک یہ نہیں ہوا ہے مجھے پوری شانتی ہونہیں سکتی۔ابا جان کے خط مجھے بھی ملتے رہتے ہیں۔

اب تمہارے (تمہیں) استانی کا کام شروع کردینا ہے۔ تمہارے خط میرے لئے سبق ہوجاتے ہیں۔میرے پر (میرے پاس) قافی (کافی) اردو خط آتے ہیں۔تم سے بڑھ

---

[1]- Ibid, (Vol. VII), Page 449, Ibid, (Vol. VIII) Page 249, Ibid,

[2]- (Vol.I), Page 144, Ibid (Vol.I) Page. 141-143

[3]- بحوالہ مہاتما (جلد) از ڈی جی ٹینڈولکر

کر کسی کے ہرف (حرف) خبسورت (خوبصورت) نہیں ہوتے۔ تمہارے ہرف (حرف) کے لئے ہی تمہارے خط بار بار پڑھنے کا دل ہوتا ہے۔ (پڑھنے کو دل چاہتا ہے) ہاں! آج کل [1] "با" دن بھی میرے ساتھ رہتی ہے۔ سردار اور مہادیو دیسائی تو ساتھ ہے ہی۔ اماں جان کو ہم سب کی طرف سے، بہت سلام۔ تمہارے لئے بہت دعا۔

یروڈہ جیل گاندھی

۱۰/ ۳/ ۳۲ء

قیاس ہے کہ مذکورہ خط کے جواب میں زہرہ انصاری نے بھی کوئی خط لکھا ہوگا جس میں گاندھی جی کی املائی غلطیوں کی انھوں نے نشان دہی کی ہوگی۔ چنانچہ زہرہ انصاری کے نام خط میں گاندھی جی نے ۱۶/ اکتوبر ۳۲ء کو لکھا اور اپنے املے کو درست کیا۔ گاندھی جی لکھتے ہیں:

پیاری بیٹی زہرہ

تمنے (تم نے) میری غلطیاں بہت اچھی طرح بتلائی ہیں، مجھے ڈر ہے کہ میں تمہارا بہت وقت لیتا ہوں، جتنا آسانی سے دے سکے (سکو) اتنا ہی دینا۔ ص۔ س۔ ث۔ کہاں کب آتے ہیں مجھے بتا سکتی ہے (ہو)؟ اسی طرح ط اور ت کا بھی ہے۔ اگر تمہارا خط بہت زیادہ خوبصورت نہیں ہے تو خوب صورت کس کو کہا جائے؟ کم از کم میں نے تو اس سے زیادہ اچھے خط نہیں دیکھے ہیں۔

ابا جان کا آج کا کوئی خط مجھے نہیں ملا ہے۔ اسلئے اچھا ہوا تم نے مجھے خبر دی ہے۔ اما(ں) جان کو ہم سب کی طرف سے آداب۔ با اب بمبئی چلی گئی ہے۔ ہم دونوں نے سوچا کی (کہ) جب مجھے کافی تاقت (طاقت) آ گئی ہے تو با کو کام پر چڑھ جانا (لگ جانا) چاہئے۔ میں جان بوجھ کر پوسٹ کارڈ ہی لکھتا ہوں۔ کیونکہ اتنا لکھنے میں ٹھیک وقت جاتا ہے۔

باپو کی بہت دعا

۱۶/ ۱۰/ ۳۲ء

---

[1] ۔ گاندھی جی کی بیوی کستوربا گاندھی، عام طور سے یہ "با" ہی کے لقب سے جانی جاتی ہیں۔ گجراتی میں "با" معنی ماں مستعمل ہے۔

مذکورہ خط سے اندازہ ہوگا کہ زہرہ انصاری کی رہنمائی میں گاندھی جی نے اپنی املائی غلطیاں درست کرلی تھیں، مثلاً پہلے خط میں خبسورت اور قافی کا املا دوسرے خط میں ''خوبصورت'' اور ''کافی'' میں تبدیل ہو چکا تھا۔

گاندھی جی نے اپنی کتاب The Way to Communal Harmony میں لکھا ہے کہ جب وہ یروڈا جیل میں تھے تو انھوں نے ریحانہ طیب جی اور زہرہ انصاری سے اردو سیکھی، انھوں نے اس بات کی بھی وضاحت کی کہ انھوں نے خط و کتابت (Correspondence) کے ذریعہ ان دو خواتین سے اردو سکھی۔ گاندھی جی کو اردو زبان میں خاصہ درک تھا۔ وہ ہمیشہ قومی زبان کی حیثیت سے ہندستانی کی وکالت کرتے تھے جس میں ملی جلی زبان استعمال ہوتی ہو۔ وہ عربی اور سنسکرت الفاظ کے خلاف نہیں تھے۔ انہیں وہ خوش آمدید کہتے تھے۔ تاہم قواعدی نقطۂ نظر سے عربی یا فارسی الفاظ کی تحریف میں ہندستانی قواعد کے اصولوں کی پابندی پر زور دیتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ریحانہ طیب جی کو جو خود اردو کی اچھی اسکالر تھیں اپنے ہندوستانی نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ اردو کے برخلاف ہندوستانی صیغۂ جمع میں ''ہنود'' کی بجائے ''ہندوؤں'' لکھنا پسند کرتے ہیں کہ یہ ہندستانی کا مزاج ہے۔[1] اردو کی مخالفت میں مخالفین کا سارا زور اردو رسم الخط پر تھا، وہ زبان کے اعتبار سے اردو کی تازگی اور شادابی کے قائل تھے۔ مگر اردو رسم الخط جو عربی اور فارسی کی علامتوں کو اپنائے ہوئے ہندستانی نظام اصوات کو بھی اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے اس کے سخت مخالف تھے۔ گاندھی جی نے اس اردو مخالف رویہ کی مخالفت کی، انھوں نے کہا کہ اردو رسم الخط کی یہ مخالفت مجھے ناپسند ہے۔ جس طرح گجراتی جو تجارت پیشہ لوگ ہیں تجارت میں دوست اور دشمن میں تمیز نہیں کرتے اور روپیہ کماتے ہیں۔ اسی طرح رسم الخط کے معاملہ میں دیوناگری اور اردو رسم الخط میں امتیاز کرنا بے معنی ہے۔ گاندھی جی نے کہا کہ دلی میں وہ روزانہ ہی ہندوؤں اور مسلمانوں سے ملتے ہیں جن میں ہندو اکثریت میں ہوتے ہیں۔ ہندوؤں کی یہ اکثریت ایسی زبان استعمال کرتی ہے جس میں سنسکرت الفاظ استعمال نہیں ہوتے اور نہ ہی

---

[1] ۔ The Way to Communal Harmony by M. K. Gandhi p 386-1-

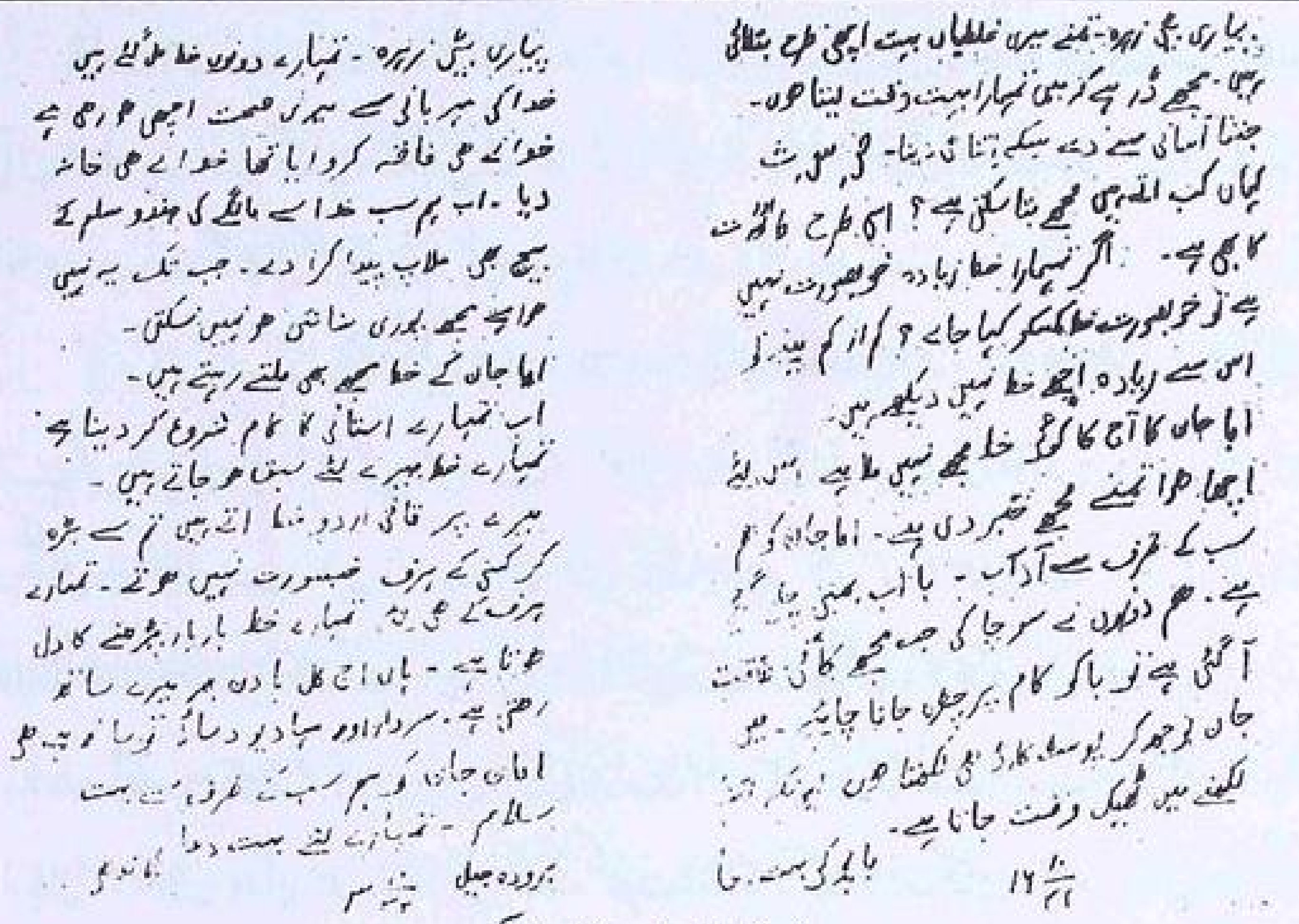

گاندھی جی کے دوخطوط کا عکس

زیادہ عربی اور فارسی استعمال ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثریت دیوناگری لکھاوٹ سے ناواقف رہتی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ جب وہ لوگ اپنی معمولی انگریزی میں مجھ سے خط و کتابت کرتے ہیں اور جب میں بیرونی زبان میں لکھنے پر ان سے باز پرس کرتا ہوں تو وہ اپنا عندیہ اردو رسم الخط میں پیش کرتے ہیں۔[1] گاندھی جی نے کہا کہ اگر ہندو اردو رسم الخط اور اردو الفاظ کا بائیکاٹ کریں گے تو نقصان انہیں کا ہوگا۔ انھوں نے اس زمانہ کی فرقہ وارانہ مخالفت اور دشمنی کے پیش نظر اردو رسم خط کی مخالفت (Bycott) کو خلاف جمہوریت رویہ (Anti-Democratic Measure) قرار دیا۔[2]

گاندھی جی کو اردو پڑھنے کی بھی اچھی خاصی مشق تھی۔ وہ اردو کتابوں کا مطالعہ بھی کرتے تھے۔ چنانچہ رسول اکرم کی سیرت اور صحابہ کی سوانح، یہاں تک کہ مولانا آزاد کی ترجمان القرآن بھی ان کے مطالعہ میں رہ چکی ہے۔ اقبال ان کے پسندیدہ شعراء میں سے تھے۔ انھوں نے ہریجن اور دیگر تحریروں میں متعدد بار اقبال کی شاعری کا ذکر کیا ہے۔ اپنی

۱۔ Ibid P. 388

۲۔ Ibid P. 389

کتاب (The Way To Communal Harmony) میں وہ اقبال کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میں اقبال کی طرح اس بات پر کامل یقین رکھتا ہوں کہ ہندو اور مسلمان جو ہمالہ جیسے پر عظمت پہاڑ کے زیر سایہ بستے ہیں، اور گنگا اور جمنا کا پانی پیتے ہیں، دنیا کے لئے اپنے اندر ایک عظیم پیغام رکھتے ہیں۔'' گاندھی جی کے اقبال کے تعلق سے یہ ارشادات معنی خیز ہیں اور ان کی مشہور نظم ''ہمالہ'' سے تعلق رکھتے ہیں، جو ''بانگ درا'' کی پہلی نظم ہے۔ اور جس کے بارے میں عبدالحق نے لکھا تھا کہ جس شاعر کی پہلی نظم اتنی بڑی ہو اس کی انتہاء کیا ہوگی؟ وہ اقبال کے مشہور زمانہ ''ترانہ ہندی'' سے بے انتہا متاثر تھے۔ اور اس نظم کے مختلف اشعار کو حسب موقع اردو میں اور کبھی ان کے انگریزی ترجمہ کے ساتھ اپنی تقریر و تحریر میں استعمال کرتے تھے۔ اس نظم سے انہیں جذباتی لگاؤ بھی تھا۔ جو ان کے فلسفہ حیات کا ایک شاعرانہ اظہار تھا۔ منو بہن گاندھی اپنی کتاب The Lonely Pilgrim میں لکھتی ہیں ''جب ہم اپنے دورے کے سلسلے میں چاند پور گئے تو گاندھی جی نے وہاں لوگوں سے اپنے آنے کا مقصد بتاتے ہوئے ان سے خواہش ظاہر کی کہ وہ اقبال کے اشعار کو اپنے اتحاد اور محبت کے ذریعہ حقیقت کا روپ دیں۔ وہ شعر ہیں۔

Religion Teaches Love not hate;
of Many Creads we are brothers still;
Indian's we're all at any rate,
India is our, Love her we will'

مذکورہ اشعار میں ''ترانہ ہندی'' کی روح جاری و ساری ہے۔ اپنی کتاب ''دی وے ٹو کمیونل ہارمونی'' The Way to Communal Harmony میں لکھتے ہیں:

''میں آج بھی اس دن کو یاد کرتا ہوں جب مرے ایک مسلمان دوست جیل میں اقبال کی نظم ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' کو ترنم سے پڑھا کرتے تھے۔ بعد میں اسی نظم کو سرلا دیوی چودھرانی کی میٹھی اور مدھر آواز میں سننے کا عادی ہو گیا تھا۔ اب یہ تیسری بار میں اس قدر میٹھی متاثر کرنے والی آواز میں اسے سن رہا ہوں۔ اس کے بول بھی اس کے سروں

ہی کی طرح میٹھے ہیں۔'' قومی زبان کے تعلق سے گاندھی جی ''ترانہ ہندی'' کی زبان کو بطور نمونہ پیش کرتے ہیں۔ ۲۵/ جنوری ۱۹۴۸ء کو راشٹر بھاشا کے مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے گاندھی جی لکھتے ہیں:

''میں اس نظم کی زبان کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ہندی، ہندستانی یا اردو؟ ممکن ہے میں اپنے وچاروں میں اکیلا ہوں گا، لیکن یہ بات صاف ہے کہ یہ نہ سنسکرت مشرت ہندی ہے، نہ فارسی آمیز اردو، یہ صرف ہندستانی ہے۔ جس کی آخر کار جیت ہونے والی ہے۔'' اپنے انہیں خیالات کو انھوں نے اقبال کے'' انتقال کے بعد ۹/ جون ۱۹۳۸ء کو وردھا سے جناب محمد حسین کے نام خط میں بھی دہرایا ہے۔ عام طور پر گاندھی جی کی انگریزی، ہندی اور گجراتی تحریر خراب تھی، مگر قارئین ملاحظہ فرمائیں کہ گاندھی جی کی اردو تحریر میں پختگی اور حسن ہے۔

اقبالؔ اردو کے ممتاز شاعر ہیں جنہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ اپنے ہم وطنوں میں اپنے فلسفہ اور طرز فکر کے ذریعہ حریت، آزادی، حب الوطنی اور قومی عظمت کے احساس کو جگایا، قومیت اور حب وطن کے جذبات جس انداز سے اقبال نے پیش کئے اس کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہمارے محب وطن شاعروں کے سرتاج ہیں۔ ترانہ ہندی، ہندستانی بچوں کا گیت، ہمالہ، تصویرِ درد، شعاعِ امید، ساقی نامہ، ذوق وشوق اور دیگر بے شمار نظموں میں قومیت اور حب الوطنی کے جذبات جس انداز سے اقبالؔ نے بھرے ہیں اس کی مثال نہیں ملتی۔ انھوں نے ان قومی جذبات کو فلسفیانہ آہنگ بخشا۔ انھوں نے صرف الفاظ کے ذریعہ ہی نہیں بلکہ بلند وبالا معیناتی سطحوں پر قوم پروری اور اتحاد واتفاق کا درس دیا۔ اقبالؔ نے اپنی شاعرانہ استعداد کو لفظی بازی گری سے ممتاز کر کے اس میں تفکر پیدا کر کے اخوت وعظمت کا پیغام دیا۔ اقبالؔ کا یہ انداز فکر اردو نظموں کے علاوہ فارسی نظموں میں بھی جاری وساری ہے۔ اور ان کی فارسی مثنوی ''جاوید نامہ'' جو اطالوی شاعر ڈانٹے کے طربیہٗ خداوندی (Devine Comedy) کے طرز پر لکھی گئی اس میں بھی ان کے قومی و وطنی احساسات اپنی معراج پر دکھائی دیتے ہیں۔

مہاتما گاندھی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بانیوں میں سے تھے۔ اس کے بانیوں کو یونیورسٹی کے لئے قابل لوگوں کی تلاش تھی۔ اقبال جو مفکر، دانشور اور عظیم شاعر تھے اور گاندھی جی جن کی

شاعری اور حب الوطنی سے متاثر بھی تھے۔ انہوں نے ایک خط کے ذریعہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی وائس چانسلر شپ کے لئے اقبال کو مدعو کیا۔ اقبال نے وائس چانسلر شپ قبول نہیں کی اور ایک خط کے ذریعہ معذرت کی۔ گاندھی جی نے اقبال کو لکھا:

"مسلم نیشنل یونیورسٹی" (جامعہ ملّیہ اسلامیہ) آپ کو آواز دے رہی ہے کہ اگر آپ اسے اپنے ہاتھ میں لے لیں تو آپ کی فاضلانہ قیادت میں یہ ترقی کر سکے گی۔ حکیم اجمل خاں کے علاوہ علی برداران کی بھی یہی خواہش ہے۔ میری آرزو ہے کہ آپ اس آواز پر لبیک کہیں۔ آپ کے اخراجات جو نئی بیداری کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوں گے بآسانی فراہم کیے جا سکیں گے۔ براہِ نوازش اس کا جواب پنڈت (موتی لال) نہرو کی معرفت الہ آباد کے پتے پر روانہ فرمائیں۔[1]

اقبال نے گاندھی جی کی پیش کش کو منظور نہیں کیا اور جواباً گاندھی جی کو لکھا:

مائی ڈیئر مسٹر گاندھی

آپ کے گرامی نامہ کا بہت بہت شکریہ جو مجھے پرسوں موصول ہوا۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ بعض وجوہ کی بنا پر جن کا ذکر ضروری نہیں اور شاید اس وقت ممکن بھی نہیں۔ ان حضرات کی آواز پر جن کی میرے دل میں بڑی عزت ہے، لبیک کہنا میرے لیے مشکل ہے۔ اگرچہ میں قومی تعلیم کے شدید حامیوں میں سے ہوں۔ لیکن یونیورسٹی کی رہنمائی کے لیے مجھ میں وہ صلاحیتیں نہیں ہیں جو مختلف کشمکشوں اور ایسی صورت میں عموماً ابتدائی مراحل میں پیدا ہوتی ہیں۔ مزید یہ کہ فطری طور پر میں پُرسکون حالات میں کام کر سکتا ہوں۔ ایک اور بات یہ بھی ہے کہ ہم جن حالات سے دوچار ہیں ان میں سیاسی آزادی سے قبل معاشی آزادی ضروری ہے اور معاشی اعتبار سے ہندوستانی مسلمان دوسرے فرقوں کے مقابلے میں بہت پیچھے ہیں۔ بنیادی

---

[1] بحوالہ۔ کلیات مکاتیب اقبال مرتبہ سید مظفر حسین برنی جلد دوم، مطبوعہ دلی اردو اکیڈمی، دلی، ص ۷-۲۱۶

طور پر انھیں ادب اور فلسفہ کی نہیں بلکہ تکنیکی تعلیم کی ضروری ہے اور اس قسم کی تعلیم پر ان حضرات کو اپنی تمام تر کوششیں مرکوز کرنی چاہئیں۔ جن حضرات نے جامعہ ملیہ قائم کی ہے انھیں چاہئے کہ اس نئے ادارے میں خصوصی طور پر طبیعی علم کے ساتھ ساتھ تکنیکی پہلوؤں پر بھی زور دیں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی مذہبی تعلیم کا بھی انتظام کریں جن کو وہ مناسب سمجھتے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ عالمِ اسلام بالخصوص عرب ملکوں اور مقدس مقامات میں جو واقعات پیش آئے ہیں ان کے پیشِ نظر ہندوستانی مسلمان کسی نہ کسی قسم کا عدمِ تعاون اختیار کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔ لیکن تعلیم کا مذہبی پہلو میرے ذہن میں ہنوز غیر واضح ہے اور میں نے پورے مسئلہ پر بحث و مباحثہ کے لیے اپنی تجاویز شائع کردی ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں شریعت کا ماہر نہیں ہوں لیکن میرا عقیدہ ہے کہ جہاں تک تعلیم کا سوال ہے موجودہ مجبوریوں کے تحت فقہ اسلامی ہماری مناسب رہنمائی کرنے سے معذور نہیں ہے۔ امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال، لاہور

(ماخذ ڈاکٹر رضی احمد، گاندھی سنگھرالیہ، نئی دہلی)

اس خط و کتابت سے اندازہ ہوتا ہے کہ گاندھی جی کے دل میں اقبال کے لئے بڑی عزت و احترام تھا۔ گاندھی جی نے اس سلسلے میں حکیم اجمل خان کو بھی لکھا تھا کہ وہ اس اہم منصب کو قبول کرنے کے لئے اقبال کو راضی کریں۔ جامعہ ملیہ کے قیام کا ابتداً ایک محدود مقصد تھا۔ اقبال کے گاندھی جی کے نام جوابی خط سے اقبال کے نظریۂ تعلیم کا بھی اندازہ ہوتا ہے جو اردو والوں کی آج بھی عصری ضرورت ہے۔

۲۰۰۷ء میں لندن میں نایاب دستاویزات کے مشہور ادارے کرسٹیز کے پاس گاندھی جی کا ایک خط فروخت کے لئے آیا۔ یہ خط گاندھی جی نے اپنی شہادت سے ۱۹؍دن قبل

تحریر کیا تھا، اس میں لکھا تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ ضبط وتحمل سے کام لیا جائے اور ہر قیمت پر اردو زبان کی حفاظت کی جائے۔ یہ خبر جولائی ۲۰۰۷ء میں اردو انگریزی اخبارات میں مشتہر ہوئی تھی۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مہاتما گاندھی اخیر دم تک اردو کے لئے مثبت جذبات رکھتے تھے۔ یہ خط انڈین ہائی کمیشن نے خریدا تھا اور اب یہ خط انڈین ہائی کمیشن (لندن) میں محفوظ ہے۔

مصر میں اردو اور اقبال

ہندوستان کی آزادی (۱۹۴۷ء) کے بعد جب مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم بنے تو انھوں نے مختلف فنون اور ہندوستانی ادبیات کی ترقی اور اشاعت کی غرض سے کل ہند نوعیت کے سرکاری و نیم سرکاری ادارے قائم کئے۔ اسی طرح مختلف ممالک کے ساتھ ہندوستان کے تہذیبی روابط کی اہمیت کے پیش نظر انڈین کاؤنسل آف کلچرل ریلیشنز کی بھی بنیاد رکھی۔ انڈین کاؤنسل آف کلچرل ریلیشنز بیرونی ممالک کے ساتھ ہندوستان کے تہذیبی و ثقافتی روابط اور رشتے قائم کرتا ہے اور ہندوستان کی رنگا رنگ تہذیبی زندگی کو دنیا سے متعارف کرانے کے فرائض انجام دیتا ہے۔ مختلف تہذیبی عوامل کے ساتھ زبانیں نہ صرف ملک کی تہذیبی زندگی سے جڑی ہوئی ہوتی ہیں، بلکہ کلیدی حیثیت رکھتی ہیں۔ ابلاغ و ترسیل کی لسانی سطح ابلاغ و ترسیل کی تمام راہوں میں سب سے زیادہ موثر راستے کا کام دیتی ہیں۔ زبانوں کے ذریعہ تاریخ و تہذیب و ثقافت سرعت سے سفر کرتے ہیں اور دلوں کو جوڑتے ہیں۔ موسیقی کی مدھر تانوں اور مصور کے بوقلموں رنگوں میں ابلاغ کی جو صورت ہے وہ بھی زبان کے تصور اور اس کے استعمال کی مرہون منت ہے۔ سُر اور تال کی ہر لے اور تصویر میں مختلف رنگ اپنی زبان

رکھتے ہیں۔ زبان تہذیبی زندگی کی روح ہے۔ زبان اور تہذیبی رشتوں کو سمجھنے کیلئے مختلف لسانی اور تہذیبی منطقوں میں لوگوں کی آمدورفت ضروری ہے۔ اسی لئے مختلف ممالک میں تہذیبی و ثقافتی تبادل ضروری ہے۔ علماء، ادیب، شاعر، اساتذہ اور مختلف فنون کے ماہرین کا مختلف ممالک میں جاکر وہاں کے علماء، ادبا، شعراء اور اساتذہ نیز طلباء کے ساتھ اظہارِ خیال کرنا کلچرل ایکسچینج یا تہذیبی تبادل کا اہم کام ہے۔ یہ کام ادبی وثقافتی سطح پر کتابوں کے ترجموں سے بھی انجام پاتا ہے۔ منتخب ادبی کتابوں یا رشحاتِ قلم کے ترجمے ثقافتی وتہذیبی تبادل میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور اس لحاظ سے ترجمہ کسی بھی طرح تخلیق سے کم اہم نہیں ہوتا، بلکہ اس مخصوص سیاق میں تخلیق پر فوقیت رکھتا ہے۔ یہاں تخلیق کی ناکامی ترجمہ کی کامیابی میں بدل جاتی ہے۔

اردو میں عربی زبان کے ترجمے کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ فورٹ ولیم کالج اور انیسویں صدی کی ابتدا میں متعدد کتابیں عربی سے اردو میں ترجمہ ہوئیں۔ سبعہ معلقات کے ترجمے ہوئے۔ یہ دور عربی، فارسی اور سنسکرت سے اردو میں نثری تراجم کا دور تھا۔ انیسویں صدی کے ربع آخر میں جب سرسید اوران کے رفقاء نے زبان وادب کے لئے نئی جہتیں تلاش کیں اور علمی تحقیقات کا دور شروع ہوا تو تحقیقی اور علمی ضروریات کے پیش نظر علامہ شبلی نے مصر، ترکی اور شام کا سفر کیا تا کہ وہ اپنے تحقیقی منصوبوں کو عملی جامہ پہنا سکیں۔ شبلی زعمائے اسلام پر اپنی تحقیقات کا آغاز کر چکے تھے۔ انہیں الفاروق، المامون، النعمان اور سیرۃ النبی جیسی کتابیں لکھ کر اسلام کے شاندار ماضی کی بازآفرینی کرنی تھی۔ اس مقصد کے لئے ضروری تھا کہ وہ عالم اسلام کا سفر کرتے اور وہاں کے کتب خانوں سے استفادہ کرتے۔ مصر، ترکی اور شام کے سفر میں شبلی نے اپنی تحقیقات کیلئے مواد اکٹھا کیا اور ''ہیروز آف اسلام'' کو نئے سرے سے علمی دنیا اور عوام کے سامنے پیش کیا۔ شبلی نے اس سفر کے حالات اور تجربات کو الگ سے ''سفرنامہ مصر وروم'' کے نام سے قلم بند کیا اور تمام تر یادوں، ملاقاتوں اور تہذیب وتمدن اور نظام تعلیم پر روشنی ڈالی۔ شبلی نے مصر کے تعلق سے جامعہ ازہر اور اس کے نظام تعلیم پر ناقدانہ روشنی ڈالی ہے۔ علامہ شبلی کا یہ سفرنامہ غالباً مشرق وسطی یا عالم عرب اور ترکی سے تعلق رکھنے والا پہلا سفرنامہ ہے جس سے ہندوستان اور مصر کے علمی وثقافتی تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔ شبلی

ایک متبحر عالم تھے۔ وہ عالم اسلام اور عالم عرب کے پرشکوہ کارناموں سے متاثر تھے۔ لیکن اپنے تبحر علمی اور اپنی فکر کی روشنی سے انھوں نے نظام تعلیم میں کوتاہیوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ وہ عالم عرب کے صرف مقلد نہیں تھے بلکہ ان کی اہمیت رہنما کی بھی ہے۔ اسکندریہ کا تاریخی کتب خانہ جو سکندر اعظم کے حملے کے بعد قائم ہوا اور جس میں ہزاروں مخطوطات اور فلسفہ وحکمت کے راز محفوظ تھے، جب دست برد زمانہ کی نذر ہو گیا تو یورپی متعصب مورخین نے اس کتب خانہ کی بربادی کے لئے سیدنا عمرؓ کو نشانہ بنایا۔ یہ ایک عجیب تاریخی بہتان تھا، جس کا مقصد زعمائے اسلام اور مسلمانوں کو علم دشمن قرار دینا تھا۔ شبلی نے کتب خانہ اسکندریہ کی بربادی کے تعلق سے متعصب یورپی مورخین کی قصہ گوئی کا علمی وتحقیقی انداز سے جواب دے کر اس سارے افسانے کو لغو قرار دیا۔ قطع نظر مذہبی اہمیت کے قرآن مجید کے ترجمے ادبی نقطہ نظر سے بھی اہم ہیں، جس کا سلسلہ دکنی دور سے شروع ہوا اور بعد میں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے تراجم سے ہوتا ہوا سر سید اور ڈپٹی نذیر احمد اور پھر مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمان القرآن اور دیگر تراجم تک پہنچا، جس سے ایک مقدس آسمانی صحیفہ کے ساتھ عربی نثر کی سب سے اعلیٰ کتاب بلاغت، ایجاز اور اختصار اور قصص وعلامات کا اردو میں تعارف ہوا۔ علامہ بوصیری کے مشہور قصیدہ بردہ کے اردو تراجم جو دکن، بمبئی، گجرات اور شمال میں ہوئے ان کی اپنی جگہ مسلم ہے۔ تاریخی کتابوں میں البیرونی کی کتاب الہند اور کتاب آغانی کے اردو تراجم بھی اسی سلسلے کی چند کڑیاں ہیں۔

ہندوستان کی کتابوں کے عربی تراجم کے سلسلے میں سنسکرت ادب کا شہکار ''پنچ تنتر'' ہے جس کا ترجمہ اولاً پہلوی اور پھر پہلوی سے عہد عباسیہ میں عبداللہ بن مقفی نے عربی میں کیا اور پھر اس عربی ترجمے نے ان اخلاق آموز کہانیوں کو شہرت عام اور بقائے دوام کی عزت بخشی۔ ہندوستانی ادبیات کے ترجمے ممکن ہے اور بھی ہوں لیکن سردست یہاں انڈین کاؤنسل آف کلچرل ریلیشنز کے ترجمہ کی طرف توجہ منعطف کرانا مقصود ہے جو ہندوستان کی پندرہ زبانوں کی منتخب کہانیوں پر مشتمل ہے۔ ہندوستانی کہانیوں کا یہ ترجمہ عربی میں ''**القصص القصیرۃ من الھند**'' کے نام سے سید احسان الرحمن نے کیا ہے اور جسے کیشب ملک نے

مرتب کیا ہے۔ اس ترجمہ میں بہابیندر ناتھ سا یکیا (آسامی)، تارا شنکر بندھوپادھیائے (بنگالی) وید راہی (ڈوگری)، گلاب داس بروکر (گجراتی) واتسائن (ہندی) بیدو سار (انگریزی) یو۔ آر۔ اننت مورتی (کنڑ) کے علاوہ سبھی ہندوستانی زبانوں کی نمائندگی ہے۔ اردو کی نمائندگی عصمت چغتائی کے افسانہ کے ترجمہ سے ہوئی ہے۔ یہ کتاب غالباً ہندوستانی کہانیوں کا عربی میں پہلا تعارف ہے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ ہندوستانی زبانوں کے منتخبہ شہ پارے عربی میں منتقل کئے جائیں۔ عربی اور اردو میں گہرا لسانی ادبی اور تہذیبی رشتہ ہے۔ ہندوستان کی دیگر زبانوں کے مقابلے میں اردو میں عربی داں اسکالروں کی ایک مستقل روایت ہے، لہٰذا یہ کام اردو کے حوالے سے بغیر کسی تاخیر کے آسانی کے ساتھ ہوسکتا ہے۔ عرب دنیا سرسید اور ان کے رفقاء، غالب اور حالی کی شاعری اور اقبال سے بڑی حد تک متعارف ہے اور اردو زبان وادب سے دلچسپی رکھتی ہے۔ لہٰذا اردو کے ادبی منتخب شہکاروں مثلاً پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو وغیرہ کی منتخب کہانیاں، مرزا رسوا کا امراؤ جان ادا، سرشار کا فسانۂ آزاد (تلخیص)، تہذیبی مطالعوں کے پیش نظر شرر کی ''گزشتہ لکھنؤ'' اردو کے منتخب انشائیے، غزلوں اور نظموں پر مشتمل ایک جامع انتخاب کے تراجم عربی عوام سے اردو ادب کا تعارف پیش کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ یہ کام ہندوستان کی یونیورسٹیوں اور قاہرہ کی یونیورسٹیوں کے عربی داں اردو اساتذہ کو کرنے چاہئے۔ یہ کام مشکل نہیں ہے، صرف تھوڑی دلچسپی اور توجہ چاہتے ہیں۔ میں ذاتی طور سے یہ سمجھتا ہوں کہ مصر اور ہندوستان کی وزارت ثقافیہ کی دلچسپی اور تعاون سے یہ کام بہتر طور پر انجام دیئے جاسکتے ہیں۔ کیشب ملک کی مرتبہ کتاب ''**القصص القصيرة من الهند**'' کی روح جو ہندوستان سے شائع ہوئی چند منتخب ہندوستانی افسانوں کے عربی ترجمے ''حدیث النہر'' نامی کتاب میں شائع ہوئے۔ اس کتاب کے مرتب اور مترجم ثریال عبدالملک ہیں۔

رفعیہ نازلی بیگم (بیگم صاحبہ ریاست جنجیرہ) نے بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں اپنی بہنوں اور بھائیوں کے ہمراہ یورپ کا سفر کیا۔ اس سفر کی یادگار ان کا سفرنامہ ''سیر یورپ'' ۱۹۱۵ء میں شائع ہوا۔ سیر یورپ کے زمانے میں وہ مصر بھی تشریف لے گئی تھیں۔ انھوں نے

اپنے اس سفرنامے میں ضمناً مصر اور قاہرہ کا ذکر کیا ہے، لیکن شبلی کے بعد قدرے تفصیل کے ساتھ مصر اور قاہرہ کے تعلق سے تفصیلی تاثرات، تجربات اور مشاہدات کا ذکر مولانا منت اللہ رحمانی کے ''سفرِ مصر و حجاز'' میں ہے۔ قاہرہ میں ''جامع شافعی'' اور آس پاس کے حالات اور زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا رحمانی نے قاہرہ میں نماز جمعہ اور قرأت کلام پاک اور اس کے تاثر کا ذکر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مصری قاریوں کی قرأت ہلا دیتی ہے۔ یہ قرآن کا اور قرآن فہمی کا اعجاز ہے۔ اس سفرنامہ سے ۱۸۹۲ء کے بعد کے قاہرہ کی تصویر محفوظ ہوگئی ہے۔ جامعۃ الازہر کا بھی ذکر ہے لیکن شبلی کے ذکر سے قدرے مختلف۔ یہ جدید قاہرہ ہے، جہاں جدید علم کی روشنی پھیل رہی ہے، اونچی اونچی سر بفلک عمارتیں اور برج آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ جامعۃ الازہر کے بعد جامعۃ القاہرہ جیسی جدید علوم کی یونیورسٹی قائم ہے۔ مولانا رحمانی نے جدید قاہرہ اور مصر کو نئے تہذیبی و ثقافتی سیاق میں دیکھا اور ہر طرح سے اظہار پسندیدگی کیا ہے۔

مصر میں ہندوستانی زبانوں کے قصے کہانیوں اور شاعری سے رجحان بڑھ رہا ہے۔ اسی طرح ہندوستانی مشاہیر کے علمی کارناموں سے استفادہ کرنے کا بھی شوق ہے۔ جو ہندوستان کے لئے بھی ضروری ہے کہ ہندوستانی مشاہیر، شعر و ادب اور قصہ کہانیوں کو عربی عوام تک پہنچائے۔ اس سلسلہ میں امید افزاء پیش رفت ہوئی ہے۔ انڈین کاؤنسل آف کلچرل ریلیشنز نے ''نل دمن'' کا ترجمہ ''**نالا و دامينتي**'' کے نام سے ۱۹۷۱ء میں شائع کیا۔ اس کتاب کے مترجم ودیع البستانی ہیں۔ اسی طرح مشہور تمل محب وطن شاعر سوبرامنیا بھارتی پر پروفیسر سوامی ناتھن کی کتاب کا ترجمہ عبدالحق بن شجاعت علی نے ''**سوبرامنيا بھارتی : مختارات من شعره و نثره**'' کے نام سے کیا۔ یہ کتاب بھی ICCR نے شائع کی۔ صبری الفضل نے ''مختارات من الآداب الآسيوية'' کے نام سے ہندوستان، چین اور کوریا کے منتخب کہانیوں کے ترجمے کیے۔ اس کتاب میں ہندوستانی ادبیات سے مندرجہ ذیل تراجم شامل ہیں۔

۱۔ **الساعة الذهبية** (The Golden Watch) از ملک راج آنند

۲-**حب السافتری** (Savitri's Love) مہابھارت سے ایک کہانی

۳-**الرسالة** (The Letter) از دھوم کیتو۔(دھوم کیتو گجراتی کے مشہور افسانہ نگار ہیں)

یہ کہانی دھوم کیتوں کی مشہور کہانی 'پوسٹ مین' کا ترجمہ ہے۔اس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر سکنیا جوہری نے راقم کی رہنمائی میں کیا تھا، جو رسالہ 'نقش کوکن' بمبئی میں شائع ہوا۔)

۴-**علبه الخیر زار** (The Bamboo Trick) از اچھینتا کمار سین

۵-**اهل الثقة** (The Confidence Men) از رابندر ناتھ ٹیگور

یہ کتاب ۱۹۹۳ء میں **مطبعه الیهئة المصریه العامة الکتاب** سے شائع ہوئی۔ ICSSR نے ایک اور کتاب **رؤیا والهند: مختارات من کتابات** کے زیر عنوان ۱۹۸۳ء میں شائع کی۔اس کتاب میں رابندر ناتھ ٹیگور، شری ویویکانند، مہاتما گاندھی، شری آربندو، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر رادھا کرشنن اور جواہر لال نہرو کی کتابوں سے ہندوستان کے بارے میں مضامین کے ترجمے ہیں۔

ایک ممتاز مصری عالم ڈاکٹر عبدالعزیز عزت نے جو عرصہ تک جامعہ ازہر سے وابستہ رہے اور ایک عرصہ تک بمبئی سے قریب بھیونڈی میں قیام فرمایا، مشہور عالم دین اور مؤرخ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کی مشہور و مستند کتاب ''ہندوستان عہدِ رسالت میں'' کا ''**العرب والهند فی عهد الرسالة**'' کے نام سے عربی میں ترجمہ کیا۔ یہ کتاب بھی ''**الهیة المصریة العامة الکتاب**'' سے ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی۔

عربی میں اردو قواعد:

انسان زبان اپنے ماحول سے سیکھتا ہے۔ تحصیل زبان کا تعلق انسانی ماحول اور فطرت سے ہے۔ جس طرح بچہ غیر محسوس طریقے سے مختلف کام انجام دیتا ہے اسی طرح وہ اپنے ماحول سے زبان بھی سیکھتا ہے۔ وہ زبان کی آوازوں کی مختلف کیفیات میں، حروف کی نشست و برخواست میں اور معنی کے تغیرات میں خود بخود فرق محسوس کرنے لگتا ہے۔ اسم، فاعل، مفعول اور فعل میں تمیز خود بخود پیدا کر لیتا ہے۔ مگر ثانوی زبان کی حیثیت سے زبان کی تدریس میں

قواعد زبان کی تعلیم اور جملوں میں الفاظ کی نشست و برخواست اوران کی معینہ جگہ کی تدریس ایک اہم لسانی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ثانوی زبان کی حیثیت سے زبان کی تدریس کے پیش نظر قواعد کی کتابیں ترتیب دی گئیں۔ اردو کی قواعد کی کتابیں مثلاً پلیٹس، فوربس، فیلن کی اردو انگریزی قواعد پر کتابیں اسی ضرورت کو مدنظر رکھ کر تحریر کی گئیں۔ اردو جو اپنی سرحدوں سے باہر قدم رکھ رہی ہے، اسے اپنے مخصوص ماحول میں تدریس کی ضروریات کے پیشِ نظر قواعد کی کتابوں کی ضرورت ہے۔ عرب ممالک اور بطورخاص قاہرہ میں اردو سے دلچسپی اوراس کی تدریسی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے غالباً پہلی بار **قواعد اللغة الاردوية** کے نام سے مرشد آباد (بنگال) کے جناب محمد لقمان الصدیقی نے اردو قواعد پر عربی میں کتاب لکھی۔ محمد لقمان صدیقی عرصہ تک مدرسۃ العالیہ کلکتہ اور جامعۃ الازہر سے منسلک تھے۔ یہ کتاب انھوں نے تقسیم ملک کے بعد ''مطبعۃ جامع فواد الاول'' سے ۱۹۴۹ء میں شائع کی۔ اس کا پیش لفظ عربی زبان کے مشہور محقق و عالم ڈاکٹر عبدالوہاب عزام نے لکھا ہے۔ ڈاکٹر عبدالوہاب عزام پاکستان میں مصر کے سفیر اور سعودی عرب میں وائس چانسلر کی حیثیت سے خدمات انجام دے چکے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالوہاب عزام نے اپنے عالمانہ پیش لفظ میں اردو زبان کی اہمیت اور ہندوستان میں اس کی مقبولیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ اگرچہ یہ زبان پاکستان کی قومی زبان بنی، یہ ہندوستان کی بھی مقبول ترین زبان ہے۔ اور خود ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو انگریزی اور اردو ہی جانتے ہیں اور بولتے ہیں اور ہندی جو ہندوستان کی قومی زبان قرار دی گئی ہے صرف لغت کی مدد سے سمجھتے ہیں۔

محمد لقمان صدیقی کی ''قواعد اللغۃ الاردویۃ'' بڑی تقطیع پر قریباً پونے دوسو صفحات پر مشتمل ایک تفصیلی قواعد ہے جس میں حروف الہجائیۃ اصطلاحات علمیہ، پر بحث کی گئی ہے۔ دوسرا باب ''علم صرف'' سے متعلق ہے جس میں اسم، اسم کی مختلف اقسام، ضمائر اوراس کی اقسام، مصدر، اقسام مصدر، حاصل مصدر، اسم فاعل اوراس کی اقسام، افعال، صفات، غرض کہ اردو قواعد کے سارے پہلو دقت نظر کے ساتھ اس طرح سے بیان کیے ہیں کہ ایک عرب طالب علم اردو زبان کی قواعد کو بہ آسانی سمجھ سکے۔ یہ کتاب وسعت علم اور دقت نظر اور قواعد

زبان سے گہری دلچسپی کا نتیجہ ہے اور اردو زبان کی بڑی خدمت ہے۔ اس کتاب پر اردو کے نامور عالم اور محقق جناب مالک رام کا مقدمہ بھی ہے۔ جس میں مرحوم مالک رام نے لقمان صدیقی کے کام کی داد دی ہے اور ان کے کام کو سراہا ہے۔ محمد لقمان صدیقی کی طرح عربی میں اردو قواعد پر دوسری کتاب ایک عرب (مصری) اسکالر ڈاکٹر سمیر عبدالحمید کی وقیع کتاب ہے جو قاہرہ سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب بھی محمد لقمان صدیقی کی مذکورہ کتاب پر اضافہ کا کام کرتی ہے اور عرب اور مصر میں اردو کے طالب علم کی عملی ضروریات کے پیش نظر جدید تقاضوں کے تحت تالیف کی گئی ہے۔ اس طرح اردو قواعد سے متعلق ان دو کتابوں کے ذریعہ عرب طلباء کی قواعدی ضروریات کسی حد تک پوری ہوگئی ہیں۔ اس بات کی البتہ ضرورت ہے کہ ایک نئی قواعد عربی میں توضیحی لسانیات کی رشنی میں لکھی جائے جسے صحیح معنوں میں توضیحی قواعد (Descriptive Grammar) کہا جا سکے۔ یہ کام بھی ڈاکٹر سمیر عبدالحمید اور جامعہ ازہر کے ایک نوجوان استاد ڈاکٹر احمد القاضی کے کرنے کا ہے۔ ڈاکٹر احمد قاضی نے چند سال پہلے (غالباً ۱۹۹۵ء میں) دلّی یونیورسٹی سی اردو میں ڈاکٹریٹ کی علاوہ جدید لسانیات میں بھی ڈپلوما حاصل کیا ہے اور اردو زبان پر اچھا عبور حاصل کیا ہے۔ اس طرح یہ دونوں مصری اساتذہ دیارِ عرب میں عربی اور اردو کی قابلِ قدر خدمات انجام دے سکتے ہیں۔

مصر میں اردو سے دلچسپی:

مصر میں اردو زبان وادب سے دلچسپی غالباً اس صدی کی ابتداء سے کی جا رہی ہے، اس کی غالباً ایک وجہ یہ ہے کہ مصر میں اردو زبان وادب کو عربی رسم الخط سے پہچانا جاتا ہے۔ دوسرے انیسویں صدی کے اواخر میں مولانا شبلی کی شخصیت نے بطور خاص مصری علماء کو اپنی طرف متوجہ کیا جنہوں نے اسلامی تاریخ اور زعمائے اسلام پر تحقیقات کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ جیسا کہ اس سے پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ الفاروق، المامون، النعمان، الغزالی اور سیرۃ النبیؐ جیسی غیر معمولی علمی تصانیف جن کی تحقیقات کے لئے بلادِ اسلامیہ کا سفر ضروری تھا اور جن کی تصنیف سے ہندوستانی مسلمان ہی نہیں بلکہ عرب وایران اور دنیا کے سبھی مسلمانوں کی دلچسپی وابستہ تھی، شبلی اور شبلی کے موضوع تحقیق کے واسطے سے اردو زبان وادب سے بھی متعارف

ہوئے۔ غالباً یہی وجہ رہی ہے کہ جامعۃ الازہر کے شعبۂ لغت وترجمہ (قسم اللغۃ والترجمۃ) میں ایک مضمون کی حیثیت سے اردو بھی شامل نصاب رہی ہے۔ جامعۃ الازہر کے بعد ہندوستان میں دارالعلوم دیوبند اور پھر ندوۃ العلماء لکھنؤ کو اسلامی علوم کے مراکز کی حیثیت کی وجہ سے ہندوستانی علماء اور علمائے ازہر میں علمی روابط قائم ہوئے ہوں اور علوم دینی کیلئے ہندوستانی طلباء کی جامعہ ازہر میں آمدورفت سے جو بالعموم اردو داں تھے، جامعہ ازہر اور دارالعلوم دیوبند اور بعد میں ندوۃ العلماء میں یہ علمی ربط، اردو اور مصر میں لسانی ربط کا پیش خیمہ بنا ہو۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی اہم ہے کہ انیسویں صدی کے ربع آخر میں نواب صدیق حسن خاں کی عبقری علمی شخصیت بھی اس علمی ولسانی ربط کا باعث بنی جن کی مساعی جمیلہ سے بمبئی کے شہرۂ آفاق عالم، صوفی وفقیہہ اور مفسر قرآن حضرت فقیہ مخدوم علی مہائمیؒ کی قرآن مجید کی تفسیر ''تبصیر الرحمن'' جو چودھویں صدی میں لکھی گئی تھی قاہرہ سے پہلی بار شائع ہوئی اور یہاں داخلِ نصاب بھی رہی۔

مصر سے اردو زبان کے اس پس منظر کے ساتھ مصر کی یونیورسٹیوں میں اردو کی تدریس کے امکانات پیدا ہوئے اور ساری دنیا میں سامراجی طاقتوں کے خلاف ردعمل شروع ہوا۔ سیاسی حالات تیزی سے بدلنے لگے اور غلام ممالک ایشیائی ملکوں کی تحریک آزادی سے دلچسپی اور اپنی تحریک کو فعال اور جاندار بنانے کے لئے دوسرے ملکوں سے روشنی حاصل کرنے لگے تو مصر نے ہندوستان کی جدوجہد آزادی سے حوصلہ پایا۔ آزادی کی تحریک میں اردو نے ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ اقبال اس سلسلے میں اردو اور فارسی شاعر کی حیثیت سے عالم عرب میں مشہور ومقبول تھے۔ وہ ہندوستان بلکہ ایشیائی اور عرب دنیا کو سامراجی طاقتوں کے خلاف نبرد آزما چاہتے تھے۔ اقبال کا یہ پیام آزادی جوان کی شاعری کا حصہ ہے، اس میں اسلامی تفکر کی تہہ داری شامل تھی اور اسلامی تاریخ کی عظمت کی پرشکوہ داستانیں پوشیدہ تھیں، مسلمانوں کے علم وحکمت کے جس میں اشاریئے محفوظ تھے، عرب دنیا نے ان کی شاعری سے دلچسپی لی اور ایک سیاست داں اور مفکر اسلام شاعر کی حیثیت سے اقبال کے پیغام پر لبیک کہا۔ اقبال کی شخصیت، شاعری اور پیغام کے واسطے سے عرب دنیا، شاعر کی زبان سے متعارف ہوئی۔ ڈاکٹر

عبدالوہاب عزام بک نے جن کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے، اقبال کی نظموں کے عربی میں ترجمے کیے۔

مصر میں اردو زبان و ادب کے تعارف کے ساتھ ہی غالباً جامعۃ الازہر کے بعد قاہرہ یونیورسٹی میں ۱۹۶۰ء کے قریب اردو کی تدریس کا انتظام کیا گیا۔ جامعۃ الازہر اور قاہرہ یونیورسٹی یں اردو کی تدریس ایک مضمون کی حیثیت سے گریجویشن (بی۔اے۔) کی سطح تک ہے جس میں طلبا حروف تہجی، ابتدائی اردو اور اردو قواعد سے واقف ہوتے ہیں۔ اردو زبان سے واقفیت کے ساتھ ان کا تعارف ہندوستان میں ''عہد وسطیٰ کی تاریخ'' اور اردو ادب کی تاریخ سے بھی کرایا جاتا ہے۔ ہندوستان کی مسلم تاریخ اور ثقافت، تاریخ ادب سے تعارف کے بعد اردو زبان کی ثقافتی اہمیت سے وہ واقف ہو جاتے ہیں اور مستقبل میں اردو کے مطالعے کے لئے راہ ہموار ہو جاتی ہے۔ قاہرہ یونیورسٹی اور جامعۃ الازہر کے علاوہ اسکندریہ یونیورسٹی میں بھی ڈگری کی سطح تک اردو کی تدریس کا انتظام ہے۔ قاہرہ میں علاقہ عین شمس میں جو فراعنہ کے عہد کا شہر ہے اور جسے حال ہی میں دریافت کیا گیا، عین شمس یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ عین شمس یونیورسٹی قاہرہ کی یونیورسٹیوں میں ایک نوعمر یونیورسٹی ہے تاہم اس کی وسعت بے پناہ ہے۔ ایک قلیل عرصہ میں اس یونیورسٹی نے مختلف سمتوں میں ترقی کی اور اب زبانوں میں عربی، انگریزی، فرانسیسی، عبرانی، اطالوی، فارسی، ترکی اور اردو شامل ہیں۔ سماجی علوم کے شعبوں کے علاوہ طب، انجینئرنگ، کامرس وغیرہ کی فیکلٹیاں بھی ہیں۔ یہ ایک مثالی یونیورسٹی ہے جو اپنے تعلیمی معیار کے لئے شہرت رکھتی ہے اور ہزاروں طلباء اور طالبات یہاں زیور تعلیم سے آراستہ ہوتے ہیں۔

جامعہ عین شمس میں ازہر اور قاہرہ یونیورسٹیوں کے برعکس اردو کی تدریس بی۔اے۔، ایم۔اے۔ اور پی۔ایچ۔ڈی۔ کی سطح تک ہوتی ہے اور اساتذہ کو مختلف یونیورسٹیوں سے مہمان اساتذہ کی حیثیت سے مدعو کیا جاتا ہے۔ ایم۔اے۔ اور پی ایچ ڈی میں بھی انہیں اساتذہ سے مدد لی جاتی ہے۔ ڈاکٹر امجد حسین جو گذشتہ ۴۰ سال سے پاکستان کی جانب سے قاہرہ اور ازہر میں اردو کے استاد رہے ہیں وہ یہاں بھی مصری الاصل اساتذہ کی مدد سے کام

دیکھتے رہے۔ ۱۹۹۵ء میں جامعہ عین شمس نے نصاب کی ترتیب اور تدویس کے لئے باقاعدہ اردو پروفیسر کا تقرر کیا تا کہ ہر سطح پر صحیح خطوط پر اردو کی تدریس اور تحقیق کا کام ہو اور نئے سرے سے یہاں کی ضروریات کے لحاظ سے نصاب بنایا جائے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگی کہ بی۔ اے۔ کے بعد جو طلباء ایم۔ اے۔ کرنا چاہیں ان کے لئے ایک سال کا ایم۔ اے۔ سے قبل تربیتی کورس پاس کرنا لازمی ہے۔ اس کورس کو ''تمہیدی'' کورس کہا جاتا ہے۔ یہاں کا نظام تعلیم اور نصاب دراصل فرانسیسی اور اطالوی یونیورسٹیوں کی طرز کا ہے۔

مصر میں اردو تحقیق:

جیسا کہ اس سے پہلے ذکر ہو چکا ہے، مصر میں اردو کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام جامعہ عین شمس میں ہے۔ یہاں ایم۔ اے۔ (میجستر) ریسرچ سے ہوتا ہے اور طالب علم ایم۔ اے۔ کی تحقیق میں تین سے پانچ سال صرف کرتا ہے۔ اس کے بعد کہیں مشکل سے ڈاکٹریٹ کے لئے داخلہ ملتا ہے۔

جامعہ عین شمس سے جن طلباء نے ایم اے (تحقیق) کیا ہے ان کے نام اور موضوعات مندرجہ ذیل ہیں:

ڈاکٹر ابتسام صالح نے بہادر شاہ ظفر پر مقالہ لکھا اور ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ بعد میں انھوں نے دبستان دہلی کے چار شعراء شاہ نصیر، ذوق دہلوی، غالب اور مومن کی شاعری پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ایک خاتون حاجر نے سرسید کی ادبی خدمات پر ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور '' حالی، شبلی، اکبر اور اقبال'' کے حوالے سے اردو کی سیاسی شاعری پر ڈاکٹریٹ کے لئے مقالہ لکھ رہی ہیں ایک اسکالر جلال ھفناوی نے حالی کے مقدمہ شعرو شاعری کا معہ مقدمہ عربی میں تعلیقات وحواشی کے ساتھ ترجمہ کیا اور پھر علامہ شبلی نعمانی کی حیات اور الفاروق کے ترجمہ اور تدوین پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اس طرح منیٰ مصطفی نے میر انیس اور مرزا دبیر کے مراثی پر ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور فارسی کے شاعر وصال شیرازی اور شیخ ابراہیم ذوق کے اردو قصائد کے تقابلی مطالعے پر ڈاکٹریٹ کے لئے کام کر رہی ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر حازم محفوظی نے میر درد پر ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور محمد حسین آزاد

کی آب حیات کے حوالے سے ''آزاد بہ حیثیت نقاد'' پر پی۔ ایچ۔ڈی حاصل کی۔ ہنا عبدالفتاح نے ڈپٹی نذیر احمد کے مشہور ناول مراۃ العروس کا عربی میں ترجمہ کیا اور اسے مقدمہ کے ساتھ مرتب کر کے ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ ایک خاتون فوزیہ نے اقبال پر ایم اے کے لئے مقالہ لکھا۔ ان میں سے چند مقالے راقم کی نظر سے گزر چکے ہیں۔ ان تحقیقی مقالات کا (جن میں ترجمہ بھی شامل ہے) معیار قابل قدر ہے اور کئی مقالے اعلیٰ معیار کے ہیں۔ مذکورہ تحقیقی مقالے عام طور پر ترتیب متن اور ترجمے کی حیثیت رکھتے ہیں اور چند ادبی شخصیات سے متعلق ہیں اس طرح کا کام ضروری ہے، تاہم ابھی لسانی، تہذیبی و ادبی نوعیت کے تحقیقی مقالات مثلاً ''عربی و اردو الفاظ کا تقابلی مطالعہ'' اردو میں مستعمل علمی اصطلاحیں، احمد شوقی اور اقبال کی وطنی شاعری کا تقابلی مطالعہ، اردو سفرناموں میں عرب و مصر کی تہذیبی و علمی زندگی کا تنقیدی مطالعہ، اقبال کی شاعری اور عالم عرب، مصر اور ہندوستان کے علمی اور ادبی روابط'' جیسے موضوعات پر کام کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اردو اور عرب ممالک اور مصر کے تہذیبی تعلقات کے لئے سودمند ثابت ہوسکیں۔

مصر میں اردو شاعری سے دلچسپی اور اقبال:

مصر میں اردو شعر و ادب سے متعلق عوامی سطح پر واقفیت کم ہے۔ اس کی وجہ شعر و ادب سے عدم دلچسپی نہیں بلکہ تعارف اور ابلاغ کی کمی ہے۔ تعلیم یافتہ طبقہ، اساتذہ اور طلباء ہندوستانی ادبیات اور بطور خاص اردو شعر و ادب سے واقف ہونا چاہتے ہیں لیکن ان کی دلچسپیاں محدود ہوگئی ہیں۔ وہ سرسید اور ان کے چند رفقاء اور علی گڑھ یونیورسٹی سے متعارف ہیں لیکن جدید اردو ادب، افسانہ، ناول، غزل، نظم سے واقف نہیں ہیں۔ ہندوستانی ادبیات میں وہ صرف دو شاعروں سے متعارف ہیں، ایک اقبال اور دوسرے ٹیگور۔ اب ادھر وہ مولانا حالی سے متعارف ہوئے ہیں اور وہ بھی بطور خاص حالی کی ''مسدس مدوجزر اسلام'' سے۔ مسدس مدوجزر اسلام سے دلچسپی کی بنیادی وجہ شاعری نہ ہوتے ہوئے اس کے موضوع، یعنی اسلامی تاریخ ہے۔ لیکن اب ادبی حلقوں میں مسدس بہ حیثیت صنف شعر سے بھی وہ متعارف ہیں۔ مسدس حالی کا دس بارہ سال قبل ڈاکٹر مجیب المصری نے عربی میں ترجمہ کیا۔ یہ کتاب قاہرہ سے شائع ہوئی ہے۔

اقبال مصر میں سب سے زیادہ مقبول شاعر ہیں۔ وہ ایک عظیم شاعر اور اسلامی مفکر کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ اقبال کی مصر میں مقبولیت کی دوسری وجہ ان کی اردو شاعری سے زیادہ فارسی شاعری ہے، چنانچہ اقبال کے فارسی کلام کے حوالے سے عربی میں ڈاکٹریٹ کے لئے مقالے لکھے گئے اور ان کی فارسی مثنویوں کے تراجم بھی ہوئے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر عبدالوہاب عزام نے ''اسرار خودی'' اور ''رموزِ بے خودی'' کا عربی میں ترجمہ کیا۔ اسی طرح انھوں نے اقبال کے تیسرے اردو مجموعۂ کلام ''ضرب کلیم'' کو بھی عربی میں منتقل کیا۔ ڈاکٹر مجیب المصری نے ''جاوید نامہ، ارمغانِ حجاز'' اور ''گلشن راز جدید'' کا عربی میں ترجمہ کیا اور کئی کتابیں اقبال پر لکھیں۔ ڈاکٹر سعید جمال الدین نے ''جاوید نامہ'' پر تنقیدی مقالہ لکھا (ڈاکٹر سعید جمال الدین عین شمس یونیورسٹی میں فارسی کے پروفیسر ہیں) اسی طرح ڈاکٹر سمیر عبدالحمید نے جو مصر کے رہنے والے ہیں اور آج کل ریاض میں اردو کے پروفیسر ہیں ''ارمغانِ حجاز'' کا عربی میں ترجمہ کیا۔ ڈاکٹر سمیر عبدالحمید کا کام دو جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد اقبال کی زندگی اور تصانیف پر تفصیلی کتاب ہے۔ دوسری جلد ''ارمغانِ حجاز'' کے عربی ترجمہ پر مشتمل ہے۔ ان کی ایک کتاب ''اقبال اور عالم عرب'' بھی ہے۔ یہ ساری کتابیں محنت اور لگن سے لکھی گئی ہیں۔ اردو شاعری سے متعلق اقبال کی مشہور نظم ''شکوہ'' کا ''حدیث الروح'' کے نام سے ترجمہ ہو چکا ہے جسے عالم عرب کی شہرۂ آفاق گلوکارہ ام کلثوم نے ساز و آہنگ کے ساتھ گایا ہے۔ ''حدیث الروح'' کے واسطے سے اردو شاعری اور اقبال کا عوام الناس سے تعارف ہوا اور اس طرح اقبال سے عوام و خواص سبھی واقف ہیں۔ [1]

''شکوہ'' کا عربی ترجمہ عربی کے نابینا شاعر صاوی تعبان نے کیا ہے۔

اردو زبان و ادب کو بین الاقوامی مقبولیت حاصل ہے۔ اردو کو یہ مقبولیت انگریزی زبان کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے، جن میں Teach Yourself Urdu اور اسی طرح کی متعدد

[1] ۔ اقبال کی طرح مصر میں ہمارے نوبل انعام یافتہ بنگالی شاعر اور ادیب رابندر ناتھ ٹیگور سے لوگ عام طور سے متعارف بھی ہیں اور متاثر بھی۔ ٹیگور کی متعدد کہانیوں اور ڈراموں کے عربی میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ ایک ترجمے کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے۔ ٹیگور ۱۹۲۶ء میں قاہرہ آئے تھے اور مصر کے ملک الشعراء احمد شوقی سے ملاقات کی تھی۔ اقبال کی بھی مصر کے ملک الشعراء اور محب وطن شاعر احمد شوقی سے اسپین میں ملاقات ہو چکی ہے۔

کتابیں جان۔ٹی۔فرتھ، فربینکس، رالف رسل اور عبدالرحمن بارکر نے تالیف کیں۔ابھی گزشتہ سال ڈاکٹر میتھیوز اور محمد قاسم دلوی نے نئے زاویہ نظر سے پھر Teach Yourself Urdu تالیف کی جولندن ہی سے شائع ہوئی۔اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس کتاب کے ساتھ اسباق Audio Tape میں بھی محفوظ ہیں تاکہ زندہ آواز (Living Voice) جو زبان سیکھنے کے لئے ضروری ہے، طالب علموں کے کانوں میں گونجتی رہے۔اسی نوعیت کی کتابیں عربی میں بھی تالیف کی جاسکتی ہیں، جن کی مدد سے عرب ممالک میں اردو سیکھنے میں آسانی ہوگی۔یہ کام ڈاکٹر سمیر عبدالحمید (ریاض) اور قاہرہ میں مقیم اردو اساتذہ بہت آسانی کے ساتھ کرسکتے ہیں۔

اردو کی منتخب کتابوں کے ترجمے انیسویں صدی میں نصابی ضروریات کے پیش نظر کئے گئے تھے بعد میں ٹی گراہم بیلی نے انگریزی میں ''مختصر تاریخ ادب اردو'' لکھی اور یہ سلسلہ آگے بڑھا۔ پروفیسر رالف رسل نے پروفیسر خورشید الاسلام کے اشتراک سے تین مغل شاعر (Three Moghal Poets) لکھی۔پھر انھوں نے غالب پر کتاب شائع کی۔امریکہ سے کولمبیا یونیورسٹی نے The Golden Tradition شائع کی جو ولی سے داغ تک اردو کے منتخب اردو غزلوں کا انگریزی ترجمہ ہے، جو عالمانہ مقدمہ کے ساتھ احمد علی کا کارنامہ ہے۔یہاں انگریزی میں اردو تراجم سے بحث نہیں ہے لہٰذا مقصود یہ ہے کہ اس طرح کے کام عربی زبان میں نہیں ہوئے ورنہ ابتداً ولی، میر، غالب، مومن، اقبال، نظیر، جوش، فیض، فراق، علی سردار جعفری، اختر الایمان اور جاں نثار اختر وغیرہ کی شاعری پر مشتمل ایک جامع انتخاب مع سوانح، حواشی اور فرہنگ و مفصل مقدمہ کے ساتھ ضروری ہے۔اسی طرح ایک انتخاب مع ترجمہ اردو افسانوں کا بھی ہونا چاہئے۔چند منتخب ناول بطور خاص امراؤ جان ادا کا ترجمہ بھی عربی میں ضروری ہے۔ امریکہ اور یورپ کی یونیورسٹیوں میں اردو کے اساتذہ نے تدریس زبان کے ساتھ علمی کام کیا ہے اور طالب علموں سے کروایا ہے، اسی طرح کا کام عرب اور بطور خاص مصر کی یونیورسٹیوں میں اردو کے اساتذہ کو ضرور کرنا چاہئے تھا، تاکہ اردو زبان و ادب عالم عرب میں فروغ پائے۔یہ کام اب مصری اسکالروں اور مصر میں مقیم اردو اساتذہ اور طلبہ کے کرنے کا ہے۔

اقبال اور احمد شوقی کی شاعری میں تاریخی حسّیت

احمد شوقی ۱۸۶۸ء میں قاہرہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی اور ثانوی تعلیم بھی قاہرہ میں ہی حاصل کی۔ بعد میں انھوں نے قانون کی ڈگری کی خاطر لاء کالج میں داخلہ لیا، لیکن پھر کلیۃ الترجمہ College of Translation میں داخلہ لیا اور وہاں سے ڈگری حاصل کی۔ یہاں سے سند حاصل کرنے کے بعد وہ ۱۸۸۷ء میں اعلیٰ تعلیم کی غرض سے فرانس چلے گئے۔ یہاں انھوں نے قانون میں ڈگری حاصل کی اور انگلستان چلے گئے۔ بیماری کی وجہ سے انہیں تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا اور وہ پوری طرح صحت یابی اور آرام کی غرض سے الجیریا چلے گئے۔ صحت یابی کے بعد پھر دوبارہ وہ فرانس چلے گئے اور اپنی تعلیم مکمل کی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد انھوں نے چند ماہ فرانس میں گزارے اور پیرس کی لائبریروں میں یورپی تہذیب وثقافت کا مطالعہ کرنے کے بعد ۱۸۹۱ء میں ترکی ہوتے ہوئے مصر لوٹے۔

۱۸۹۱ء تا ۱۹۱۵ء کا زمانہ شوقی کی زندگی کا مالی اعتبار سے سب سے اچھا زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ اس زمانے میں انھوں نے ''شاعر العزیز'' کے نام سے شہرت حاصل کی تھی اور ۱۹۱۴ء

میں جنیوا میں منعقدہ موتمر علوم شرقیہ Oriental Conferess میں حکومتِ مصر کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت کی۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۹ء تک شوقی ملک بدر رہے اور اسپین میں قیام رہا۔ اپنی اس جلاوطنی کی وجہ سے اپنے ملک اور اپنے ہم وطنوں کے تئیں ان کے جذبات میں شدت پیدا ہوتی گئی۔ ۱۹۱۹ء میں جب مصر کے سیاسی حالات بہتر ہوئے تو پھر شوقی مصر چلے آئے۔ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۲ء تک کا دور احمد شوقی کی ادبی زندگی کا سب سے زرخیز دور سمجھا جاتا ہے۔ اس عرصہ میں انھوں نے اپنے آپ کو پوری طرح زبان و ادب کی خدمت کے لئے وقف کر دیا تھا۔ احمد شوقی کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ۱۹۲۷ء میں ایک اعلیٰ سطح پر تہنیتی جلسے کا انعقاد کیا گیا جس میں عرب دنیا کے شاعروں اور ادیبوں نے شرکت کی اور احمد شوقی کی ادبی خدمات کو سراہا اور انہیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اس موقع پر انہیں ''امیر الشعراء'' کے لقب سے بھی نوازا گیا۔ شوقی کا مجموعہ شاعری ''الشوقیات'' کے نام سے چار جلدوں میں شائع ہوا۔ اس مجموعے کے علاوہ شوقی نے متعدد ڈرامے اور ناول بھی لکھے۔ ان کے ڈراموں میں ''کلیو پترا'' اور ''مجنوں لیلہ'' بہت مشہور ہوئے۔

شوقی کی شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلا دور ۱۸۹۱ء تا ۱۹۱۵ء میں ان کا موضوع شعر اور اسلوب کلاسیکی عرب شاعروں سے مماثلت رکھتا ہے۔ اس عہد کی شاعری کا ایک بڑا حصہ طویل نظموں پر مشتمل ہے، جس میں قصائد، مراثی، غزل، احساسِ ذات Self Glorification اور خمریات شامل ہیں۔ ناقدین کا کہنا ہے کہ اس عہد کی شاعری کلاسیکی شعراء سے متاثر ہو کر کی گئی ہے اور طرزِ اظہار اور اندازِ بیان کے اعتبار سے کلاسیکی شاعری کی نقل معلوم ہوتی ہے، تاہم یہ ندرت، قوتِ اظہار اور سلاستِ بیان کی بھی مظہر ہے، اس میں نئی تشبیہیں، استعارے اور تمثیلیں بھی استعمال ہوئی ہیں۔ اس میں انسانی نفسیات کے گہرے مطالعے شامل ہیں۔ شوقی کی شاعری کا دوسرا دور ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۹ء کا دور ہے۔ یہ شوقی کے جلاوطنی کی زمانہ ہے ۔اس دور میں شوقی کے یہاں احساسِ محرومی اور غم کی کیفیات زیادہ ہیں جو بعد میں انسانی غم والم کا روپ اختیار کر لیتی ہیں۔ انھوں نے اس عہد میں بدلے ہوئے حالات کو نئے زمانے کی ضرورتوں اور سماجی تبدیلیوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور عوام میں ایک مخصوص عصری شعور

بیدار کرنے کی کوشش کی۔ تیسرے دور کی شاعری (۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۲ء تک) شوقی کے جلاوطنی کے بعد کی شاعری سے عبارت ہے، جس میں ان کا دل نہ صرف حبِ وطن سے سرشار اور مصری عوام کی محبت، عزت اور وقار ان کی شاعری کا موضوع ہے، بلکہ وہ سارے ان ممالک اور ان انسانوں کے جذبات کی نمائندگی کرتی ہی جو آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے تھے۔ اور جو سامراج کے ظلم اور تشدد اور انسانیت سوز حرکتوں کے خلاف لڑ رہے تھے۔ اس عہد کی شاعری کا پیغام صرف مصری عوام کے لئے نہ تھا بلکہ ساری انسانیت اور غلامی میں جکڑی ہوئی عالمِ انسانیت کے لئے تھا، اور خصوصاً عرب اور مشرقی اقوام کے لئے تھا جو آزادی حاصل کرنے میں کوشاں تھے اور جو ظلم اور استبداد سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ یہیں پر موضوعات اور مقصد میں احمد شوقی کی شاعری اقبال کی شاعری سے مماثلت پیدا کرتی ہے۔

احمد شوقی کی شاعری اقبال کی شاعری کی طرح تاریخی شعور سے پیدا ہوتی ہے، یہ تاریخی شعور ابتداً ملکی تاریخ اور اس کے شاندار ماضی سے شروع ہوتا ہے اور بعد میں مخصوص تہذیبی تقاضوں، معتقدات، عصری حالات کے آئینہ میں پائیدار مستقبل کی تلاش اور باعزت زندگی اور عزتِ نفس، جیو اور جینے دو اور اپنی شناخت کے ساتھ احترامِ آدمیت کے آفاقی تصور پر ختم ہوتا ہے۔ بانگ درا کی پہلی نظم "ہمالہ" ہو، ترانہ ہندی ہو، تصویرِ درد ہو، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت ہو یا نیا شوالہ اور اسی قبیل کی دوسری نظمیں۔ اقبال کے اپنے ملک و وطن کے تئیں شدید اظہارِ محبت یا جذبۂ عشق سے پیدا ہوتی ہیں، اس میں ملک کے شاندار ماضی، اس کی تہذیبی و علمی روایات اس کا فلسفہ و دانش، اس کے سورما بھی موجود ہیں، پھر یہ وطن کی محبت تاریخ کے وسیع دھارے میں مدغم ہوتی ہے اور ایک وسیع تناظر اختیار کر کے شاعر کے معتقدات اور اسلامی پس منظر میں اپنے تاریخی شعور میں وسعت پیدا کرتے ہوئے، عالمی اور آفاقی تہذیب کی تلاش میں، نئی منزلوں سے ہمکنار ہوتی ہے۔ یہاں جو خیالات میں تنوع اور پھیلاؤ ہے، وہ تنگ دامنی نہیں بلکہ انسانیت نوازی کا اور احترامِ آدمیت کے خوشگوار اور صحت پسند تصور پر صاد ہے۔ تاریخی شعور کی پہلی منزل فطرتاً اپنا وطن ہوتا ہے، اس کے بعد اس سے ملحقہ تہذیبی و تاریخی عوامل ہوتے ہیں، تاریخی شعور ایک نرم رو بہتا ہوا آبشار ایک دریا ہے جو

اپنے چشمہ سے نکل کر وادیوں اور کہساروں سے ہوتا ہوا، زمینوں کو سیراب کرتا ہوا سمندر میں ملنے کے لئے بے تاب رہتا ہے، اقبال کی شاعری اس کی وطن دوستی، عالم اسلام اور بین الاقوامیت کا تصور ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں ہیں۔ کیا ہندوستان کا گیت گانے سے وہ کم تر درجے کے شاعر ہوئے یا اسلامی تہذیب و تاریخ کے آئینہ میں اپنے خیالات پیش کرنے سے ان کی حب الوطنی پایۂ اعتبار کھوگئی یا انسانیت اور آدمی کا گیت گانے سے وہ کم پایہ کے مسلمان اور اسلام پسند ہوئے؟ احمد شوقی اور اقبال کا زمانہ ایک ہے، وہ ایک ہی عہد کی نمائندگی کرتے ہیں، ایک ہندوستان کا نغمہ خواں ہے تو دوسرا مصر کا، ایک ہندوستان کے ماضی کے سحر و شام دیکھنے کا خواہش مند ہے اور شاندار ماضی میں ایک روحانی اور فکری مسرت محسوس کرتا ہے تو دوسرا مصر کی شاندار تہذیب سے اپنا رشتہ جوڑتا ہے، اس عہد اور اس کے علمی وفنی و تہذیب پر سر بلند ہوتا ہے اور تاریخی آثار کو عالم، ادیب اور شاعر کبھی تاریخی نقطۂ نظر سے اور کبھی شاعرانہ پیرایہ میں دیکھتا ہے۔ ''اہرامِ مصر'' کا تعلق نہ ہندوستان کی تاریخ سے ہے نہ ہی اسلامی عظمت سے، یہ قدیم مصری تاریخ کی عظمت و سطوت سے تعلق رکھتے ہیں جن کا تعلق فراعنہ کی تہذیب سے ہے۔ اقبالؔ نے اہرامِ مصر کو ایک مخصوص نگاہ سے دیکھا۔ اقبال کے یہاں عظمتِ آدم اور اس کی ہنر مندی کا احساس ہے۔ لکھتے ہیں:

اس دشتِ جگر تاب کی خاموش فضا میں
فطرت نے فقط ریت کے ٹیلے کیے تعمیر
اہرام کی عظمت سے نگوں سار ہیں افلاک
کس ہاتھ نے کھینچی ابدیت کی یہ تصویر؟
فطرت کی غلامی سے کہ آزاد ہنر کو
صیاد ہیں مردانِ ہنر مند کہ نخچیر؟[1]

---

[1] مصر کے ایک اور شاعر البرودی کے یہاں بھی حب الوطنی کے جذبات ملتے ہیں۔ البرودی مصر کے وزیر اعظم رہ چکے ہیں، وہ عربی کے ایک منفرد شاعر بھی تھے، جنہوں نے مصر کی تحریکِ آزادی میں حصہ لیا۔ وہ مصر کی مشہور عرابی تحریک سے وابستہ تھے۔ وہ اپنے مصری تاریخی ورثہ پر فخر کرتے تھے، انھوں نے بھی اہرامِ مصر کی عظمت پر نظم کہی ہے۔ اہرامِ مصر قاہرہ سے قریب جنحرہ میں ایستادہ ہیں۔

اسی طرح اپنی نظم ''اہلِ مصر سے'' میں مشہورِ زمانہ ''ابوالہول'' کے تعلق سے ایک مخصوص شاعرانہ اور فلسفیانہ انداز سے اس طرح تبصرہ کرتے ہیں۔

خود ابوالہول نے یہ نکتہ سکھایا مجھ کو
وہ ابوالہول کہ ہے صاحبِ اسرارِ قدیم
دفعتہً جس سے بدل جاتی ہے تقدیرِ امم
ہے وہ قوت کہ حریف اس کی نہیں عقلِ حلیم
ہر زمانے میں دگرگوں ہے طبیعت اس کی
کبھی شمشیرِ محمدؐ ہے، کبھی چوبِ کلیمؑ

احمد شوقی نے بھی ''ابوالہول'' پر نظم کہی اور توتن خامون، اور اہرام اور تہذیبِ فراعنہ پر اور وادیٔ نیل پر بھی۔ احمد شوقی کا تعلق چونکہ مصر سے ہے، اس لئے ان کا رویہ اپنی تخلیقات سے اقبال کے بمقابلہ جدا ہے، احمد شوقی ''ابی الھول'' یا توتن خامون یا وادیٔ نیل کی تہذیب کو اپنے ملک وقوم کی عظمتِ ماضی کے پیرایہ میں دیکھتے ہیں، یہ عظمت ان کی اپنی جغرافیائی اور سیاسی حدود کا بحیثیت ملکِ مصر کے، ایک حصہ ہے۔ اقبال کی نظمیں اس کے برعکس انسانی عظمت کا اعتراف ہیں۔ اقبال نے ہندوستان سے متعلق جو محبت سے سرشار ہو کر نظمیں کہی ہیں یا جن شخصیتوں کے وہ ثنا خواں رہیں، ان میں اقبال کا محدود ثقافتی شعور (اپنے ملک و وطن کے سیاق میں) کارفرما ہے، مثلاً اقبال کی نظم ''رام'' یا ''نانک'' یا تہذیبی اور تاریخی اشارے اور علامتیں جو ان کی مختلف نظموں میں چاندنی کی طرح چھٹکی ہوئی ملتی ہیں، احمد شوقی کے مصری رویّے سے مناسبت رکھتی ہیں۔ اقبال اور احمد شوقی کی یہ نظمیں اپنے اندر یکسانیت رکھنے کے باوجود ایک نہیں ہیں۔ ہر دو رویّوں کا تعلق اپنی سیاسی یا جغرافیائی سرزمین کے سیاق سے ہے۔

علامہ اقبال بمبئی میں

(محی الدین غازی اجمیری نے "علامہ اقبال بمبئی میں" کے زیر عنوان اپنی یادداشتوں پر مشتمل یہ مضمون لکھا جو روزنامہ "جنگ" مورخہ ۲۱/اپریل ۱۹۶۸ء میں اشاعت پذیر ہوا۔)

آل انڈیا خلافت کمیٹی کے سکریٹری کی حیثیت سے میرے قیام بمبئی کے دوران علامہ کی آمد بمبئی میں تین بار ہوئی۔ پہلی دفعہ کہیں اور مقیم تھے دوپہر کے کھانے پر خلافت ہاؤس لائے گئے۔ ماحول خوشگوار، مکینوں کو مانوس و یگانہ پایا۔ پروگرام کے خلاف خلافت ہاؤس میں دوپہر بسر کی۔ سہ پہر چائے نوشی کے بعد اصلی قیام گاہ پر اور دوسرے دن بمبئی سے مراجعت فرما گئے۔ کچھ عرصہ بعد دوبارہ تشریف آوری ہوئی اسٹیشن ہی سے کوئی قدرشناس ان کو لے اڑے اور ہم دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ لیکن علامہ میزبان کو سمجھا بجھا کر شام کو عین چائے کے وقت سامان سمیت خلافت ہاؤس پہنچ گئے ایسا محسوس ہوا کہ جسم میں جان آ گئی۔ ہر شخص دیدہ و دل فرش راہ کرنے کے لئے آگے بڑھا۔ خلافت کا سارا کاروبار معطل ہو کر رہ گیا اور ہر کارکن اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر علامہ گرد گھومنے لگا۔ ہم سب گل افشاں گفتار سے لطف اندوز اور

خدمت گزاری کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوتے رہے۔ اس بار علامہ بہت کھل کر رہے۔ اور ان کی حکیمانہ اور فلسفیانہ نکتہ آفرینیوں سے ہمارے دلوں اور دماغ کو بڑی روشنی ملی۔ علامہ کی طرف سے حقہ کی فرمائش ہم سب کے لئے عقدۂ لاینحل بن گئی ہے۔ سب کارکنانِ خلافت ایک اچھی پوزیشن رکھتے تھے اور جس حیثیت کے تھے اس سے اپنے کو کچھ برتر ہی تصور کرتے تھے لیکن علامہ کے اس مطالبے نے ہماری ساری شیخی کرکری کر کے رکھ دی۔ اب ہم خلافت ہاؤس کے اردگرد جھونپڑیوں کا طواف کر رہے تھے اور ہوٹلوں کے ملازمین کی خوشامد کرتے پھر رہے تھے کہ کسی سے چلم حاصل کی، کسی سے نیچہ لیا۔ کسی نے حقہ کی نے ہاتھ میں تھما دی۔ کسی نے نہایت بدبودار تمباکو کو ہاتھ پر رکھ دیا۔ کسی نے تمباکو کا نہایت بدقطع کالا کلوٹا ڈبہ تھما دیا۔ الغرض بدقت تمام اجزاء فراہم کر کے لائے اور حقہ تیار کر کے علامہ کے سامنے رکھا۔ علامہ نے حقّے کی نے ہاتھ میں لی حقّے کے درمیانی حصے کو چھوا اور تیوری پر قدرے بل ڈال کر فرمایا کہ ارے اس کو تازہ نہیں کیا!

حقہ اور تازہ!..... ہم اسی کے مفہوم پر ہی غور کر رہے تھے کہ حاضرین میں سے حقّے کے کسی ماہر نے ''تازہ'' کے مفہوم پر روشنی ڈالی ایک صاحب نے حقہ اٹھایا اور نل کے نیچے رکھ کر چلم سمیت اس پر پانی بہا دیا۔ چلم میں سے شعلہ بھڑکا اور چشم زدن میں آگ بجھ گئی اور راکھ مع تمباکو کے بہہ گئی۔ اس معمولی تاخیر ہونے پر علامہ خود نل پر گئے۔ دیکھا کہ پھر از سرِ نو چلم میں تمباکو اور آگ رکھی جا رہی ہے۔ بہت ہنسے اور فرمایا معلوم ہوتا ہے کہ آپ میں سے کسی کو بھی حقہ بھرنے کی تمیز اور اس کی لطافت کا ذوق نہیں ہے۔ یہ تو بڑی کمی ہے۔ تیسری بار علامہ کی آمد اور خلافت ہاؤس میں قیام کی اطلاع ملتے ہی ہم سب بجائے اس کے کہ خوشیاں مناتے حقّے کے اجزاء کی فراہمی کے لئے فکرمند ہو گئے اور مختلف بازاروں کی سمت دوڑ پڑے جس جس بازار میں اس کے اچھے سے اچھے اجزاء مل سکتے تھے وہاں پہنچے اور تمام اجزاء سے حقّے کا جو مجموعہ تیار ہوا وہ بڑا ہی خوشنما اور دلفریب تھا۔ ابھی ہم اس بحث ہی میں الجھے ہوئے تھے کہ اس حقّے کو دیکھ کر علامہ کس طرح اظہار خوشنودی و پسندیدگی فرمائیں گے کہ کسی نے تمباکو کی یاد دلا کر بحث میں کھنڈت ڈال دی معلوم ہوا کہ حقّے کی روح تمباکو تو لائے ہی نہیں جس کے بغیر حقّے کا وجود اور اس کی ساری خوشنمائیاں بےکار ہیں۔ اب تمباکو کا مسئلہ تھا اور ہم تھے ردّ و کد کے بعد طے ہوا کہ معمولی تمباکو تو

بدبودار اور واہیات ہوتی ہے۔ لکھنؤ کا تازہ سے تازہ خمیرہ لانا چاہئے چنانچہ ٹیلی فون کے ذریعے ماہرین و مبصرین کی نشان دہی پر ایسی چند دکانوں کا پتہ نشان معلوم کر کے لکھنؤ کا نہایت عمدہ خمیرہ بڑی مقدار میں خرید کیا گیا۔ ستم ظریف دکان دار جب دام وصول کر کے خمیرہ سر منڈھ کر چکا تو اس نے منہ کھولا اور ہم سب کو ایک اور نئے قسم کے آزار میں مبتلا کر دیا۔ کہنے لگا یہ خمیرہ بے کار ہے جب تک اس میں گڑھا کو (ایک نئے قسم کے نہایت کریہہ تمباکو کا ملغوبہ) کی پرانے گڑ کے سامنے آمیزش نہ کی جائے کام نہ چل سکے گا۔ بہر حال اس کے نشان پتہ بتلانے پر گڑھا کو اور پرانا گڑ تلاش کر کے لائے اسی کی بتلائی ہوئی مقدار و ترکیب کے مطابق ایک صاف پتھر پر ان اجزاء کو اوپر تلے دھر کر خوب کٹائی کی گئی تا آنکہ معجون مرکب قسم کا کالا کالا حلوہ سا تیار ہو گیا۔ رات کا زیادہ حصہ خلافت ہاؤس کی صفائی کے اہتمام میں بسر کیا اور کم حصہ سو کر کاٹا۔ صبح چائے اور ناشتے کے بجائے حقے کو تیار کرنے کی فکر دامن گیر رہی۔ طے ہوا کہ علامہ جوں ہی ہال میں تشریف فرما ہوں، فوراً سلگتا ہوا، خوشبوئیں بکھیرتا ہوا تازہ بتازہ گرما گرم حقہ ان کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ یہ بات کہنے کی تو نہیں ہے لیکن اس سے پتہ چلتا ہے کہ لوگوں کے قلوب پر علامہ کی عظمت و محبت کے کیسے گہرے نقوش ثبت تھے کہ ہم میں سے ہر شخص جو بزعمِ لیڈری عالمِ اسلام و متحدہ ہندوستان کی بڑی سے بڑی شخصیت کو خاطر میں نہ لاتا تھا اس کے دل میں یہ خواہش پنہاں تھی کہ سب سے پہلے علامہ کی خدمت میں حقہ پیش کر کے سرخروئی حاصل کرے۔ ایک بار کسی صاحب نے علامہ سے سوال کر دیا کہ ''حقے میں کیا مزہ ملتا ہے'' مختصر، سادہ معنی خیز جواب ملا ''پی کر دیکھو'' یہ اسی طوالت کا اختصار ہے

ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

علامہ کا قیام اس بار خلافت ہاؤس میں دو ہفتے رہا بمبئی جیسے بین الاقوامی اور لکھوکھا انسانوں کی بستی کے شہر میں مرکزی خلافت کمیٹی کا دفتر، خلافت ہاؤس ویسے ہی مرجعِ خلائق رہتا تھا لیکن علامہ کی تشریف آوری کی بات ہی کچھ اور تھی۔ انسانوں کا سیلاب امنڈتا رہتا تھا اور صبح سے شام تک ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارے بمبئی کی آبادیاں خلافت ہاؤس میں سمٹ آئی ہیں۔ اس چودہ روزہ قیام کے دوران چند عجیب اور بعض حد درجہ دلچسپ واقعات پیش آئے۔ اس دوران بیگم عطیہ فیضی سے ان کی ملاقاتیں بھی ہوتیں۔ اور جس بزم میں مولانا شبلی تابِ نظر نہ

لا سکے تھے اور خدمت کے ایک ہی پرتو سے مدہوش ہو چکے تھے۔'' وہاں اقبال من وماہت کہ ازیں گونہ ہزاراں دی است کہتے دامن کشاں وچشم کشا گزر گئے۔'' کچھ یہ بات نہ تھی کہ علامہ مولانا کی طرح صاحبِ ذوق نہ تھے بات یہ تھی کہ علامہ حقیقت کو پا چکے تھے ان کی نظر کا شانہ بیت الحرم اور مدینہ کی طرف اٹھ چکی تھی اور مولانا کے سفر کی جو انتہا اور معراج تھی اس سے تو علامہ کی مسافرت کا آغاز ہوا تھا۔ اس سلسلہ کی کچھ تفصیلات کمتر صراحتاً اور بیشتر اشارۃً اس دوران میں سامنے آتی تھیں۔

آج کی صحبت میں علامہ کے دورانِ قیام بمبئی کے دفتر پارینہ کا ایک ورق نذرِ قارئین کیا جارہا ہے۔

علامہ خلافت ہاؤس میں مقیم تھے سابق خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالمجید خاں وینس میں عالمِ تنہائی کی زندگی بسر کررہے تھے۔ پورا شاہی خاندان ان کے ہمراہ تھا۔ ان کو سب سے بڑی فکر...... شادی لڑکیوں کو ٹھکانے لگانے کی تھی۔ نظامِ حیدرآباد اپنے دونوں شہزادوں اعظم ومعظم جاہ کی شادی کسی اعلیٰ شاہی قسم کے خاندان میں کرنے کے لئے پیچ وتاب کھارہے تھے۔ نہیں کہا جاسکتا کہ شہزادگانِ دکن (اعظم جاہ ومعظم جاہ) اور ترک شہزادیاں درشاہوار ونیلوفر کو سلکِ عقد میں منسلک کرنے کا خیال پہلے نظام کو آیا یا معزول خلیفہ کو یا مولانا شوکت علی کو۔ بہرحال مولانا محرک بنے اور شہزادگان رونمائی کے لئے خلیفہ کی جائے پناہ پر پہنچا دیئے گئے۔ مولانا کے کمرے میں محفل رونمائی برپا ہوئی۔ مستقبل کے دولہا ودولہنوں کا آمنا سامنا ہوا۔ دلہنوں کی پسند پر تو پردہ ہی پڑا رہا البتہ شہزادگانِ عالی بتار بری طرح ریجھ گئے۔ بہرحال خلیفہ نے پیغام قبول کرلیا۔ اس کے بعد نظام کو اس ساری صورت حال سے مطلع کردیا گیا اور اب باقاعدہ مسائل ومعاملات طے ہونے لگے۔ اور پھر دیس میں شہزادگان کا کوئی محرمِ راز بھی نہ تھا جس کے سامنے وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال لیا کرتے۔

حیدرآباد کے کچھ وزراء اور اعلیٰ حکام ساتھ تھے جن کے سامنے وہ کھل نہیں سکتے تھے۔ پھر ان کی خشک مزاجیاں بھلا کہاں تک ساتھ دے سکتی تھیں۔ لے دے کر ایک مولانا شوکت علی اپنی جسمانی ہولناکیوں اور معنوی رعنائیوں کے ساتھ وہاں موجود تھے جن کو بحالتِ مجبوری

دونوں شہزادگان اپنی اپنی پیتا سنا کر دل کا بوجھ ہلکا کرلیا کرتے تھے۔ الجھے ہوئے مسائل شوکت صاحب کے ناخنِ تدبیر سے سلجھ گئے۔ جادۂ صد سالہ اپنی دوری و درازی کے باوجود ایک ہی آہ میں طے ہوگیا اور فریقین عقد کی لڑی میں پرو دیئے گئے۔ شہزادگان کی واپسی دلہنوں کے جلو میں طے پا گئی اور تمام ممالک محروسہ دکن میں جہاز کے بمبئی پہنچنے کے وقت و تاریخ کا سرکاری اعلان شائع ہوگیا۔

یوں بھی اس پر مسرت تقریب کے موقع پر بمبئی میں شہزادگان اور دلہنوں کے خیر مقدم کے لئے ہزاروں کا اجتماع متوقع تھا۔

''عام خیال یہ تھا کہ اس استقبال میں اعلیٰ حضرت کی خوشنودی کا باعث ہوگی۔''

اس کے بعد عام طور پر یہ اندازہ کرلیا گیا کہ استقبال میں ڈیڑھ دو لاکھ سے کم کا مجمع نہیں ہوگا۔

اب سرگزشت کا اصلی واقعہ آتا ہے۔

حیدرآباد دکن کے گل فروشوں (ہار پھول کے تاجروں) کے چند خاندانوں نے مل کر طے کیا کہ اس زریں موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے اعلیٰ قسم کے پھولوں کی شاندار لاکھ ڈیڑھ لاکھ مالائیں تیار کی جائیں۔ ان کو زرتار کرکے اور بھی شان دوبالا کردی جائے۔ ہار تین قسم کے ہوں۔ قسم اول کی قیمت پانچ روئے۔ قسم دوم دو روپے۔ تیسری قسم آٹھ آنے۔ چنانچہ اس منصوبہ کے ماتحت انھوں نے خود ان کے بیان کے مطابق پھولوں کی فراہمی اور ہاروں کی تیاری پر پچیس تیس ہزار روپیہ صرف کیا۔ ڈیڑھ لاکھ سے بھی زیادہ ہر قسم کی مالائیں تیار کرلیں اور ان کو تروتازہ کرنے کی تمام تدابیر کو بروئے کار لاکر دو تین دن پہلے بمبئی آدھمکے۔ یہاں آتے ہی انھوں نے ہزاروں ہینڈ بلوں، پوسٹروں اور اخبارات کے ذریعے ایڈورٹائز کیا اور ہاروں کے چربے اور فوٹو بھی شائع کردیئے۔ بیلا ڈ پیر کے طویل و عریض ہال میں استقبالی مظاہرہ طے پاچکا تھا اور وہاں اس سلسلے کے انتظامات اور ہال کے آراستہ و پیراستہ کرنے میں حیدرآباد کے ذمہ دار حکام شبانہ روز مصروف تھے۔ گل فروشوں نے بیلا ڈ پیر کے اسی ہال کے بالمقابل سڑک کے پار ایک ہوٹل کا بڑا ہال بدقّت و منت بقول ان کے چھ سات ہزار روپے

میں دو دن کے لئے کرایہ پر حاصل کرلیا اور مالاؤں سے اس ہال (دوکان) کو پاٹ دیا اور کچھ ہاروں سے سجا بھی دیا اور اس تصور میں مگن ہو گئے کہ دن کے نو دس بجے جہاز کے آنے سے پہلے صبح منہ اندھیرے استقبالی پبلک کی آمد کا آغاز ہو جائے گا اور ہر استقبال اس دوکان سے ہار خریدتا ہوا بیلا ڈ پیر کے استقبالی ہال میں داخل ہو جائے گا۔ ادھر یہ دل خوش کن تخیل آرائیاں تھیں اور خوب خوب خیالی پلاؤ پک رہے تھے ادھر قدرت اس استقبالی نظام کو درہم برہم کرنے کا تہیہ کر چکی تھی۔ دفعتاً یہ خبر بجلی کی طرح پبلک کے کانوں سے ٹکرائی کہ اس جہاز سے گاندھی جی بھی آرہے ہیں۔

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے اختتام کے بعد گاندھی جی راستے میں جگہ جگہ قیام کرتے ہوئے ہندوستان واپس آرہے تھے اور پورٹ سعید سے شہزادوں اور ان کی دلہنوں کے اسی جہاز میں سوار اور برابر براجمان ہو گئے۔ اب سارا بمبئی صبح منہ اندھیرے ہی ان کا سواگت کرنے کے لئے الٹ پڑا اور احمد آباد، سورت، کاٹھیاواڑہ، گجرات، پونہ، مہاراشٹر وغیرہ وغیرہ مضافاتی علاقوں سے اور قرب وجوار سے راتوں رات جس قدر درشنی آسکتے تھے وہ بھی بیلا ڈ پیر پر آدھمکے۔ حیدرآبادی قافلے کے لاکھ دو لاکھ افراد تک کے تو بیلا ڈ پیر اس کا ہال اور اطراف متحمل ہو سکتے تھے۔ لیکن گاندھی جی کے ٹڈی دل استقبالیوں کی سمائی کیسے ممکن تھی؟ نتیجہ یہ ہوا کہ حیدرآباد کے دو ڈیڑھ لاکھ استقبالی گاندھی جی کے چھ سات لاکھ استقبالیوں کے اروب میں آگئے اور آٹے میں نمک کی طرح تحلیل ہو کر اس اژدہام میں کھو گئے۔ کیسی ہار پھولوں کی مالائیں۔ اور کیسا استقبال و خیر مقدم۔ سب دھرا کا دھرا رہ گیا۔ گلفروشوں کا برا حال تھا۔ ان کے تیس ہزار روپئے پھنس گئے تھے۔ جن کی واپسی کا کوئی سوال نہ تھا۔

ان دنوں خلافت والے اپنے ایثار اور محیر العقول کارناموں کی وجہ سے پبلک کے دلوں میں اس قدر اتر گئے تھے کہ ان کو قضا و قدر کے کارخانے میں دخیل سمجھ لیا گیا تھا ایسے ہی تاثرات کے ماتحت کچھ لوگوں نے گل فروشوں کو مشورہ دیا کہ خلافت ہاؤس جاؤ، وہاں شاید کوئی صورت اور اس مشکل کا حل نکل آئے۔ میں خلافت کے دفتر میں اپنی نشست پر کام کر رہا تھا کہ پچیس تیس افراد پر مشتمل ایک انبوہ روتا پیٹتا دفتر میں داخل ہوا۔ ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ

رہی تھیں۔ چیخ چیخ کر رو رہے تھے۔ کسی کے آنسو بہہ رہے تھے کسی کی آنکھیں خشک تھیں مگر صورت روہانسی بنی ہوئی تھی۔ دریافت کرنے پر ان لوگوں نے ساری داستانِ غم سنا ڈالی۔ ایک دو باتیں کہتے تھے اور بیچ میں کچھ کچھ رو بھی لیتے تھے۔ سب کچھ سننے کے بعد ہم سب حیران و سراسیمہ ہو کر رہ گئے اور دیر تک سوچ بچار کے بعد صرف یہی کہہ سکتے کہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔ ہمارے بس میں کیا ہے۔'' مایوسی کے یہ کلمات سن کر وہ لوگ اور بھی بے قرار ہو گئے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ وہ رو رہے تھے اور ہم حیران و ششدر ان کو دیکھ رہے تھے۔ دفتر خلافت میں گریہ وزاری کا کہرام بپا تھا اور متحیر و مایوسی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اسی کے بالائی حصے میں شاعر مشرق علامہ اقبال اقامت گزیں تھے۔ دفعتاً علامہ کی تصویر ابھری اور نگاہوں میں گھوم گئی۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور ان لوگوں سے کہتا ہوا کہ ''ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں۔ کچھ ہار نمونے کے طور پر لیتا ہوا بالائی منزل پر پہنچ گیا وہاں علامہ اپنی حالت میں گم اور حسبِ دستور آنکھیں بند کئے کسی فکر میں غرق تھے میں نے قریب پہنچ کر قدرے اونچی آواز میں کہا ؎

خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

علامہ آنکھیں کھولیں فرمایا ''بیٹھو'' کیا بات ہے؟ میں نے گل فروشوں کی تمام کتھا ایک ہی سانس میں سنا دی اور یہ بھی ظاہر کر دیا کہ غالباً کل شام تک شہزادگان حیدرآباد روانہ ہو جائیں گے۔ ان کی اسپیشل تیار کھڑی ہے۔ علامہ نے قدرے تامل کیا۔ ہاتھ بڑھا کر میرے ہاتھ سے وہ مالائیں لے لیں اور ان کو بغور دیکھا۔ فرمایا ہار کتنی تعداد میں ہیں۔ میں نے عرض کیا لاکھ ڈیڑھ لاکھ ہوں گے یا کچھ کم و بیش'' فرمایا ''اسپیشل کتنی لمبی ہے میں نے کہا بڑی لمبی ہے۔ شیطان کی آنت کی طرح ہے۔'' فرمایا کہ ان ہاروں سے پوری اسپیشل کو سجا کر دلہن کیوں نہ بنا دیا جائے؟'' میں علامہ کی ساری اسکیم سمجھ گیا جو ان کے ذہن میں آ چکی تھی۔ میں نے تائید کی۔ ٹیلیفون کی طرف ہاتھ لہراتے ہوئے فرمایا ''فون قریب لاؤ'' اور سر اکبر حیدری سے ملا دو۔ میں نے قریب میز سے فون اٹھا کر علامہ کے قریب رکھا۔ رسیور اٹھا کر ڈائل گھمایا۔ سر اکبر حیدری کا اسپیشل نمبر مل گیا۔ اس طرف سے خود حیدری بول رہے تھے۔ علامہ نے ساری رام کہانی سنا کر فرمایا کہ حکومتِ نظام یہ سب ہار مقررہ قیمت پر خرید لے اور ان گلفروشوں ہی کو

اس کی اندر باہر سے سجا دینے پر مامور کر دیا جائے۔ یہ اسپیشل بجائے خود ایک عجوبہ اور نئی چیز ہوگی۔ یہاں سے دکن تک کی فضائیں معطر ہوتی چلی جائیں گی اور ایک دلکش نظارہ اور اچھا تماشا رہے گا۔ سر اکبر نے علامہ کی بات بھی پوری نہ ہونے دی اور بڑی بے تابی سے کہا کہ ان گلفروشوں کو فوراً نظام پیلس بھیج دیا جائے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسپیشل کو سجانے کا مسئلہ سر اکبر کے زیر غور تھا کہ علامہ نے ان کی مشکل حل کر دی۔ میں نے نیچے پہنچ کر ان لوگوں سے کہا کہ ایک منٹ ضائع کئے بغیر نظام پیلس پہنچو اور سر اکبر حیدری سے ملو۔ یہ لوگ بھاگم بھاگ نظام پیلس جا پہنچے اور سر اکبر نے سارے ہاروں سے اسپیشل سجا دینے کے لئے ان لوگوں کو باضابطہ مامور کر کے آرڈر دے دیا۔ چار پانچ بجے شام سے تمام رات اور دن کے گیارہ بجے تک یہ لوگ اسپیشل سجاتے رہے اور واقعی اس کو دلہن بنا کر رکھ دیا۔ دوپہر کے قریب سر اکبر آئے کام کو پسند کیا اور پوری قیمت اور سجائی کی اجرت اسی وقت ادا کر دی۔

دوسرے دن صبح ہی صبح پانچ چھ ٹیکسیاں خلافت ہاؤس میں داخل ہوئیں۔ ان میں سے گلفروش نکلے اور مٹھائیوں اور فروٹس کے چند ٹوکرے بھی برآمد ہوئے۔ ان لوگوں نے یہاں پہنچ کر اور وفورِ محبت سے بے قابو ہو کر عجیب مجنونانہ حرکتیں کیں۔ خلافت ہاؤس کو سر پر اٹھا لیا۔ ہم لوگوں کو کندھوں پر بٹھا لیا۔ سروں، چہروں اور رخساروں کو چوم چوم کر گندا کر دیا اور خواہش ظاہر کی کہ علامہ کی زیارت کرائی جائے۔ علامہ بدقت اس پر تیار ہو سکے کہ ہال کی کھڑکی کے سامنے آ گئے سب کے سلاموں کا جواب دیا۔ فروٹ اور مٹھائیوں کے متعلق فرمایا کہ یہ غیر ضروری تکلیف اور تکلف کیوں کیا۔ اور اتنا فرما کر اپنی جگہ جا بیٹھے۔ مٹھائی اور فروٹ میں سے بقدر قلیل ایک سینی میں سجا کر علامہ کی خدمت میں پیش کیے گئے جس پر آپ نے صرف غلط انداز نگاہ ڈالی۔ لیکن علامہ کی سردمہری نے حاشیہ نشینوں کو سرگرم عمل کر دیا اور وہ سارا خوان چٹ کر گئے۔ فروٹس اور مٹھائیوں کے ٹوکروں پر خلافت کمیٹی، خلافت اخبار اور خلافت پریس کے کارکن ٹوٹ پڑے اور یہ ٹوکرے چشم زدن میں خالی ہو گئے اور حضرت اقدس خواجہ اعظم اجمیری نور اللہ مرقدہٗ کی دیگ لٹنے کا سماں آنکھوں میں پھر گیا۔

اقبال کی زندگی کے چند گوشے

غازی محی الدین اجمیری [1]

ایک سہانی شام کو آل انڈیا خلافت کمیٹی کے صدر دفتر خلافت ہاؤس بمبئی میں علامہ اقبال کا تار ملا:

''کل صبح فرنٹیر میل سے پہونچ رہا ہوں۔ اگر لوہے کا کارخانہ منتقل ہو چکا ہو تو وہیں قیام کروں گا، حقّے کا انتظام رکھنا۔''

میرے قیام بمبئی کے دوران علامہ کی یہ آمد تیسری بار تھی (۱۹۳۱ء) اس سے پہلے دو مرتبہ آچکے تھے۔ پہلی دفعہ کہیں اور مقیم تھے، دوپہر کے کھانے پر خلافت ہاؤس آئے یا لائے گئے۔ ماحول خوشگوار، مکینوں کو مانوس و یگانہ پایا۔ پروگرام کے خلاف خلافت ہاؤس میں دوپہر بسر کی۔ سہ پہر چائے نوشی کے بعد اصل قیام گاہ پر اور دوسرے دن بمبئی سے مراجعت فرما گئے۔ کچھ عرصہ بعد دوبارہ تشریف آوری ہوئی۔ اسٹیشن ہی سے کوئی قدر شناس ان کو لے اڑے اور ہم دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ لیکن علامہ میزبان کو سمجھا بجھا کر شام کو عین چائے کے وقت سامان سمیت خلافت ہاؤس پہنچ گئے۔ ہم نے محسوس کیا کہ جسم میں جان آگئی۔ ہر فرد دیدہ و دل

---

[1]۔ *منتخب مقالات (اقبال ریویو)، مرتبہ: ڈاکٹر وحید قریشی، اقبال اکیڈمی، پاکستان، مارچ ۱۹۸۳ء

فرش راہ کرنے کے لئے آگے بڑھا۔ خلافت کا سارا کاروبار معطل ہو کر رہ گیا اور ہر کارکن اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر علامہ کے محور پر ان کے گرد گھومنے لگا۔ ایک شبانہ روز ہم سب گل افشانئ گفتار سے لطف اندوز اور خدمت گزاری کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوتے رہے۔ اس بار علامہ بہت کھل کر رہے۔ اور ان کی حکیمانہ اور فلسفیانہ نکتہ آفرینیوں سے ہمارے دلوں اور دماغ کو بڑی روشنی ملی۔

اس دو روزہ قیام میں دو واقعات ایسے پیش آئے جن کو قارئین غالباً دلچسپی کے ساتھ پڑھیں گے: ایک حقے کا پرابلم، دوسرا لوہے کے کارخانے کا انتقال۔

دورانِ قیام میں علامہ کی طرف سے حقے کی فرمائش ہم سب کے لئے لاینحل عقدہ اور پرابلم بن گئی۔ ہمسب کارکنانِ خلافت ایک اچھی پوزیشن رکھتے تھے اور جس حیثیت کے تھے اس سے اپنے کو کچھ برتر ہی تصور کرتے تھے لیکن علامہ کے اس مطالبے نے ہماری ساری شیخی کرکری کر کے رکھ دی۔ اب ہم خلافت ہاؤس کے ارد گرد جھونپڑیوں کا طواف کر رہے تھے اور ہوٹلوں کے ملازمین کی خوشامد کرتے پھر رہے تھے کہ کسی سے چلم حاصل کی، کسی سے نیچہ لیا۔ کسی نے حقہ کی نے ہاتھ میں تھما۔ کسی نے نہایت بد بودار تمباکو کو ہاتھ پر رکھ دیا۔ کسی نے تمباکو کا نہایت بدقطع کالا کلوٹا ڈبہ تھما دیا۔ الغرض بدقت تمام اجزاء فراہم کر کے لائے اور حقہ تیار کر کے علامہ کے سامنے رکھا۔ علامہ نے حقّے کی نے ہاتھ میں لی حقّے کے درمیانی حصے کو چھوا اور تیوری پر قدرے شل ڈال کر فرمایا کہ ارے اس کو تازہ نہیں کیا!

حقہ اور تازہ!.... ہم اسی کے مفہوم پر ہی غور کر رہے تھے کہ حاضرین میں سے حقے کے کسی ماہر نے "تازہ" کے مفہوم پر روشنی ڈالی ایک صاحب نے حقہ اٹھایا اور نل کے نیچے رکھ کر چلم سمیت اس پر پانی بہا دیا۔ چلم میں سے شعلہ بھڑکا اور چشم زدن میں آگ بجھ گئی اور راکھ مع تمباکو کے بہہ گئی۔ اس معمولی تاخیر ہونے پر علامہ خود نل پر پہونچے۔ دیکھا کہ پھر از سر نو چلم میں تمباکو اور آگ رکھی جا رہی ہے۔ بہت ہنسے اور فرمایا معلوم ہوتا ہے کہ آپ میں سے کسی کو بھی حقہ بھرنے کی تمیز اور اس کی لطافت کا ذوق نہیں ہے۔ یہ تو بڑی کمی ہے۔ جبھی تو یک نالۂ مستانہ ز جائے نہ شنیدم۔

پہلی تشریف آوری کے دوران جبکہ کھانے کے بعد دوپہر میں خلافت ہاؤس ہی میں استراحت فرما ہوئے تھے چائے نوشی کے وقت ارشاد فرمایا تھا کہ مجھے یہاں بڑا سکون اور راحت ملی البتہ کبھی کبھی سامنے کے کارخانے سے جو کھڑ کھڑاہٹ کی آواز آتی ہے اس سے بڑی اذیت پہونچتی رہی ۔ بڑی ہی سامعہ خراش آواز ہے، قلب وروح کو اس سے بڑی اذیت پہونچتی ہے ۔ اس دل خراش آواز کا قصہ یہ تھا کہ خلافت ہاؤس کے جنوب کی جانب لوہے کا ایک بہت بڑا کارخانہ تھا۔ یہاں لوہے کی سلاخیں ڈھالی جاتی تھیں اور پھر ان کو دھار دار اوزاروں سے قطع کر کے ہموار کیا جاتا تھا۔ اس سے وقفے وقفے کے بعد دل خراش آواز پیدا ہوکر سارے گردوپیش کو پریشان اور مبتلائے اذیت رکھتی تھی۔ علامہ جیسا نازک احساسات اور لطیف جذبات سے بھرپور انسان بھلا اس انکرالصوات سے کیونکر متاثر و متاذی نہ ہوتا؟ ہم اور گردوپیش میں بسنے والے تمام افراد اس کارخانے سے یہاں کے ہٹادینے کے سلسلے میں ہمہ قسم کی مساعی کے باوجود ناکام اور مایوس ہو چکے تھے۔ جب دوسری بار علامہ دودن کے لئے تشریف فرما ہوئے تو پہلے ہی دن کارخانے نے اذیت رسانی کا مظاہرہ کیا۔ علامہ نے تیور بدل کر اپنے آپ کو مخاطب کر کے فرمایا: اچھا کل دیکھیں گے۔ دوسرے دن نو دس بجے کے قریب فرمایا کہ میرے ساتھ چلو۔ میں ساتھ ہولیا۔ فرمایا اس کارخانے کو یہاں سے منتقل کردینے کا جس آفیسر کو اختیار ہے اس کے دفتر چلو۔ میں نہ صرف آفیسر بلکہ معاملے کے تمام قانونی پہلوؤں اور مالہ و ماعلیہ سے واقف تھا۔ میں نے راستے میں کچھ قانونی نقطے بھی گوش گزار کردیئے۔ ہم دفتر پہونچے۔ ایک سرکاری دفتر میں علامۃ المشرق کی آمد بالکل خلاف توقع تھی، ہل چل مچ گئی۔ آفیسر نے خود آئین وقانون اور رسم ورواج کی بندشیں توڑ کر آگے بڑھ کر استقبال وخیر مقدم کیا اور بڑے ہی اعزاز واکرام کے ساتھ علامہ کو اپنی کرسی پر بٹھایا اور خود ایک طرف کرسی پر بیٹھ گیا۔ اول کچھ فلسفیانہ باتیں ہوئیں۔ اس کے بعد علامہ نے کارخانے کا تذکرہ کیا اور قانونی دلائل پیش کئے جن کے اس نے بڑے خوشگوار انداز میں جوابات دیے۔ آخر علامہ نے جذباتی انداز میں فرمایا کہ بمبئی جیسے ہنگامہ خیز شہر میں خلافت ہاؤس ہی ایسی جگہ ہے جہاں مجھے سکون مل سکتا تھا، لیکن اس کارخانے کی وجہ سے وہاں بھی اطمینان میسر نہیں۔

آفیسر سپر انداز ہوگیا اور شد و مد سے وعدہ کیا کہ جلد ہی وہ کارخانے کو وہاں سے کہیں اور منتقل کردے گا۔ چنانچہ دو چار ہی ماہ میں کارخانہ وہاں سے کہیں اور منتقل ہوگیا اور علامہ کی بدولت تمام اہالیانِ محلہ کو اس سوہانِ روح عذاب سے نجات مل گئی۔

تار میں اسی لوہے کے کارخانہ کا ذکر تھا۔ علامہ کا تار ملتے ہی ہم سب بجائے اس کے کہ ان کی آمد پر خوشیاں مناتے حقے کے اجزاء کی فراہمی کے لئے فکر مند ہوگئے اور مختلف بازاروں کی سمت دوڑ پڑے جس جس بازار میں اس کے اچھے سے اچھے اجزاء مل سکتے تھے وہاں پہنچے اور تمام اجزاء سے حقے کا جو مجموعہ تیار ہوا وہ بڑا ہی خوشنما اور دلفریب تھا۔ ابھی ہم اس بحث ہی میں الجھے ہوئے تھے کہ اس حقے کو دیکھ کر علامہ کس طرح اظہار خوشنودی و پسندیدگی فرمائیں گے کہ کسی نے تمباکو کی یاد دلا کر بحث میں کھنڈت ڈال دی۔ معلوم ہوا کہ حقے کی روح تمباکو تو لائے ہی نہیں جس کے بغیر حقے کا وجود اور اس کی ساری خوشنمائیاں بے کار ہیں۔

اب تمباکو کا مسئلہ تھا اور ہم تھے ردّ و کد کے بعد طے ہوا کہ معمولی تمباکو تو بدبودار اور واہیات ہوتی ہے۔ لکھنؤ کا تازہ سے تازہ خمیرہ لانا چاہئے چنانچہ ٹیلی فون کے ذریعے ماہرین و مبصرین کی نشان دہی پر ایسی چند دکانوں کا پتہ نشان معلوم کر کے لکھنؤ کا نہایت عمدہ خمیرہ بڑی مقدار میں خرید کیا گیا۔ ستم ظریف دکان دار جب دام وصول کر کے خمیرہ سر منڈھ کر چکا تو اس نے منہ کھولا اور ہم سب کو ایک اور نئے قسم کے آزار میں مبتلا کر دیا۔ کہنے لگا یہ خمیرہ بے کار ہے جب تک اس میں گڑھا کو (ایک نئے قسم کے نہایت کریہہ تمباکو کا ملغوبہ) کی پرانے گڑ کے سامنے آمیزش نہ کی جائے کام نہ چل سکے گا۔ بہر حال اس کے نشان پتہ بتلانے پر گڑھا کو اور پرانا گڑ تلاش کر کے لائے اسی کی بتلائی ہوئی مقدار و ترکیب کے مطابق ایک صاف پتھر پر ان اجزاء کو اوپر تلے دھر کر خوب کٹائی کی گئی تا آنکہ معجون مرکب قسم کا کالا کالا حلوہ سا تیار ہوگیا۔ رات کا زیادہ حصہ خلافت ہاؤس کی صفائی کے اہتمام میں بسر کیا اور کم حصہ سو کر کاٹا۔ صبح چائے اور ناشتے کے بجائے حقے کے چالو کرنے کی فکر دامن گیر رہی۔ طے ہوا کہ علامہ جوں ہی ہال میں تشریف فرما ہوں، فوراً سلگتا ہوا، خوشبوئیں بکھیرتا ہوا تازہ بتازہ گرما گرم حقہ ان کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ یہ بات کہنے کی تو نہیں ہے لیکن اس سے پتہ چلتا ہے کہ لوگوں کے قلوب پر

علامہ کی عظمت و محبت کے کیسے گہرے نقوش ثبت تھے کہ ہم میں سے ہر شخص جو بزعم لیڈری عالمِ اسلام و متحدہ ہندوستان کی بڑی سے بڑی شخصیت کو خاطر میں نہ لاتا تھا اس کے دل میں یہ خواہش پنہاں تھی کہ سب سے پہلے علامہ کی خدمت میں حقہ پیش کر کے سرخروئی حاصل کرے۔

ایک بار مجھ جیسے کسی منچلے نے علامہ سے سوال کر دیا کہ ''حقے میں کیا مزہ ملتا ہے'' مختصر، سادہ اور معنی خیز جواب ملا ''پی کر دیکھو'' یہ اسی طوالت کا اختصار ہے

ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

علامہ کا قیام اس بار خلافت ہاؤس میں چودہ دن رہا بمبئی جیسے بین الاقوامی اور لکھوکھا انسانوں کی بستی کے شہر میں مرکزی خلافت کمیٹی کا دفتر، خلافت ہاؤس ویسے ہی مرجعِ خلائق رہتا تھا لیکن علامہ کی تشریف آوری کی بات ہی کچھ اور تھی۔ انسانوں کا سیلاب امنڈتا رہتا تھا اور صبح سے شام تک ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارے بمبئی کی آبادیاں خلافت ہاؤس میں سمٹ آئی ہیں۔

بھائی کلہ روڈ کے پل سے ایک طویل سڑک خط جوہری کی طرح مجگاؤں تک چلی گئی ہے۔ قریب قریب اسی کے درمیان خلافت ہاؤس کی شاندار عمارت واقع ہے۔ علامہ کا پروگرام روز بنتا تھا اور سختی کے ساتھ اس کی پابندی کی جاتی تھی۔ خاص کر ان کے آرام کے اوقات میں خلل اندازی کسی قیمت پر نہیں ہونے دیجاتی تھی۔ کچھ وقت ان کے غور و فکر اور فلسفیانہ استغراق کے لئے بھی ہوتا تھا جس میں کسی کو مخل نہیں ہونے دیا جاتا تھا۔

اس چودہ روزہ قیام کے دوران چند عجیب اور بعض حد درجہ دلچسپ واقعات پیش آئے۔ جن کی تفصیلات علامہ کی عظمت اور جلالت شان اور ان کے فقید المثال اخلاق و کردار کی آئینہ دار ہو سکتی ہیں۔ یہ تفصیلات مرتب ہو کر مقالات کی صورت میں ہدیۂ قارئین ہوتی رہیں گی۔ والاتمام من اللہ تعالیٰ

آج کی صحبت میں اسی دفترِ پارینہ کا ایک ورق نذرِ قارئین کیا جا رہا ہے۔ علامہ خلافت ہاؤس میں مقیم تھے۔ سابق خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالمجید خاں وینس میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ پورا شاہی خاندان ان کے ساتھ تھا۔ صدہا تفکرات ان کو گھیرے ہوئے تھے۔

سب سے بڑی فکر ان کو قابلِ شادی لڑکیوں کو ٹھکانے لگانے کی تھی۔

نظامِ حیدر آباد اپنے دونوں شہزادوں اعظم و معظم جاہ کی شادی کسی اعلیٰ شاہی قسم کے خاندان میں کرنے کے لئے پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ مولانا شوکت علی عالم اسلامی کا رشتہ جوڑتے جوڑتے کبھی کبھی انفرادی رشتے ناتے کی منزل زیریں پر بھی اتر آیا کرتے تھے۔

نہیں کہا جا سکتا کہ اس قران السعدین یعنی شہزادگانِ دکن (اعظم جاہ و معظم جاہ) اور درِ شاہی (درِ شاہوار و نیلوفر) کو سلکِ عقد میں منسلک کرنے کا خیال پہلے نظام کو آیا یا معزول خلیفہ کو یا مولانا شوکت علی کو۔ بہر حال مولانا محرک بنے اور شہزادگان رونمائی کے لئے خلیفہ کی جائے پناہ پر پہنچا دیئے گئے۔ مولانا کے کمرے میں مجلس رونمائی برپا ہوئی۔ مستقبل کے دولہا و دولہنوں کا آمنا سامنا ہوا۔ دلہنوں کی پسند پر تو پردہ ہی پڑا رہا البتہ شہزادگانِ عالی تبار بری طرح ریجھ گئے اور اس بساط پر اپنا سب کچھ بلکہ دل و جان تک ہار آئے۔ بساطِ عشق پر جان و دل کی بازی ہار جانے والوں ہی کو حریم وصل میں وقار کے ساتھ یار مل سکتا ہے ؎

دل و جان اگر ببازی بہ بساط عشق بازی

بحریم وصل جاناں بوقار خواہی آمد

نظام کو اس ساری صورت حال سے مطلع کر دیا گیا اور اب باقاعدہ مسائل و معاملات طے ہونے لگے۔ نظام قارون کو شکست فاش دے دینے کے باوجود بڑے جزرس اور کائیاں تھے۔ جو شرائط اجڑے ہوئے حریم خلافت سے پیش ہوتی تھیں ان میں مین میخ ضرور نکالتے رہتے تھے اور اس طرح معاملات میں طوالتیں اور مسائل میں الجھنیں پیدا ہوتی رہتی تھیں۔ شہزادگان ان طوالتوں اور الجھنوں سے بڑے پریشان رہتے تھے اور وہ ہر قیمت پر جلد سے جلد یہ سودہ کر لینا چاہتے تھے۔ ان کی پیش نظر ایک صوفی شاعر کی مثال تھی جو محبوب ہندی کے خال رخ پر سمرقند و بخارا تک نچھاور کرنے کو تیار ہو چکا تھا۔ یہاں تو ہندی خال رخ کے مقابلے میں ترکی حسن و جمال تھا جو اپنی بھرپور رعنائیوں، شادابیوں اور فتنہ سامانیوں کے ساتھ شہزادگان دکن کے نظام جسم و روح کو تہ و بالا کئے دے رہا تھا۔ اس پردیس میں شہزادگان کا کوئی محرمِ راز بھی نہ تھا جس کے سامنے وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال لیا کرتے۔

حیدر آباد کے کچھ وزراء اور اعلیٰ حکام ساتھ تھے جن کے سامنے وہ کھل نہیں سکتے تھے۔ پھر ان کی خشک مزاجیاں بھلا جان ہار شہزادگان کی تر دامنیوں کا ساتھ کہاں تک دے سکتی تھیں! لے دے کر ایک مولانا شوکت علی اپنی جسمانی ہولناکیوں اور معنوی رعنائیوں کے ساتھ وہاں موجود تھے جن کو بحالتِ مجبوری دونوں شہزادگان اپنی اپنی بپتائیں اور کتھائیں سنا کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیا کرتے تھے۔ مولانا علی گڑھ کے کھلنڈرے رہ چکے تھے۔ وہ شہزادگان کے ساتھ یہ کھیل بھی کھیل لیا کرتے تھے اور انکی ڈھارس بندھا دیا کرتے تھے۔ اس سلسلے کی داستانیں اس قدر دلچسپ و دل آویز اور مضحک ہیں کہ سننے والا دیوار قہقہہ بن کر رہ جائے۔ کبھی کبھی شوکت صاحب لہر میں آجاتے تھے تو ہم لوگ دنیا و مافیہا سے یکسو ہو کر یہ داستانیں سننے بیٹھ جاتے تھے اور ہفتوں ہمارے دل و دماغ ان سے چاشنی گیر و لذت چش رہتے تھے۔ شہزادگان کا گھڑی گھڑی بے چین ہو کر ہو کر مولانا کمرے میں آنا اور تازہ اطلاعات کے ضمن میں کسی مایوس کن خبر سے متاثر ہو کر ٹھیٹ حیدر آبادی لب ولہجہ میں الفاظ ذیل ادا کرنا ''مولا......اب کیا ہونا...... یوں لطف نہیں آنے کا۔'' مولانا کے الف کو دیر تک اور دور تک کھینچتے ہوئے لے جایئے، پھر ''اب کیا'' کو آدھا ادھورا ادا کر کے ''ہونا'' پر پہونچ جایئے اور اس کے ''نا'' کے ساتھ ہمزہ ملا کر اس کو جھٹکے دے دے کر دیر تک نا...... کرتے رہیئے تب آپ گوہر افشانی کا لطف لے سکیں گے۔ بہر حال اس قسم کی باتیں محفل رنداں کے حریم راز کی امانت ہوا کرتی ہیں۔ ان کو علانیہ طشت از بام کرنا خلافِ مصلحت سمجھا جاتا رہا ہے۔ لہٰذا اس جمالیاتی اور ادبی ورق کو الٹ کر:

دگر از سر گرفتم رشتۂ زلف پریشان را

الجھے ہوئے مسائل شوکت صاحب کے ناخنِ تدبیر سے سلجھ گئے۔ جادۂ صد سالہ اپنی دوری و درازی کے باوجود ایک ہی آہ میں طے ہو گیا اور عقد ہو گیا۔ شہزادگان کی واپسی دلہنوں کے خاندان کے کثیر افراد کے جلو میں طے پا گئی اور تمام ممالک محروسہ دکن میں جہاز کے بمبئی پہنچنے کے وقت و تاریخ کا سرکاری اعلان شائع ہو گیا۔

ایسے بھی اس پر مسرت تقریب کے موقع پر بمبئی میں شہزادگان اور دلہنوں کے خیر مقدم کے لئے ہزاروں کا اجتماع متوقع تھا کہ سمند تاز پر تازیانہ پڑ گیا اور عمائدینِ ریاست اور عامہ

رعایا کے کانوں میں بات پھونک دی گئی کہ اس استقبال میں شرکت اعلیٰ حضرات کی خوشنودی کا باعث ہوگی۔ اس نفخ صور کے بعد عام طور پر یہ اندازہ کرلیا گیا کہ استقبال میں ڈیڑھ دو لاکھ سے کم کا اجتماع نہ ہوگا۔

اب سرگزشت کا اصلی واقعہ آتا ہے۔

حیدر آباد دکن کے گل فروشوں (ہار پھول کے تاجروں) کے چند خاندانوں نے ایک میٹنگ میں طے کیا کہ اس زریں موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے اعلیٰ قسم کے پھولوں کی شاندار لاکھ ڈیڑھ لاکھ مالائیں (ہار) تیار کی جائیں۔ ان کو زرتار کرکے اور بھی شان دوبالا کردی جائے۔ ہار تین قسم کے ہوں۔ قسم اول کی قیمت پانچ روپے۔ قسم دوم دو روپے۔ تیسری قسم آٹھ آنے۔ چنانچہ اس منصوبہ کے ماتحت انھوں نے خود ان کے بیان کے مطابق پھولوں کی فراہمی اور ہاروں کی تیاری پر قریب پچیس تیس ہزار روپیہ صرف کیا اور ڈیڑھ لاکھ سے بھی زیادہ ہر قسم کی مالائیں تیار کرلیں اور ان کو تروتازہ کرنے کی تمام تدابیر کو بروئے کار لاکر دو تین دن پہلے بمبئی آدھمکے۔ یہاں آتے ہی انھوں نے ہزاروں ہینڈ بلوں، پوسٹروں اور اخبارات کے ذریعے ایڈورٹائز کیا اور ہاروں کے چربے اور فوٹو بھی شائع کردیئے۔ بیلا ڈ پیر کے طویل و عریض ہال میں استقبالی مظاہرہ طے پاچکا تھا اور وہاں اس سلسلے کے انتظامات اور ہال کے آراستہ و پیراستہ کرنے میں حیدر آباد کے ذمہ دار حکام شبانہ روز مصروف تھے۔ گل فروشوں نے بیلا ڈ پیر کے اسی ہال کے بالمقابل سڑک کے پار ایک ہوٹل کا بڑا ہال بدقت ومنت بقول ان کے چھ سات ہزار روپئے میں دو دن کے لئے کرایہ پر حاصل کرلیا اور مالاؤں سے اس ہال (دوکان) کو پاٹ دیا اور بطور ایڈورٹائز کچھ ہاروں سے سجا بھی دیا اور اس تصور میں مگن ہوگئے کہ دن کے نو دس بجے جہاز کے آنے سے پہلے صبح منہ اندھیرے استقبالی پبلک کی آمد کا آغاز ہوجائے گا اور ہر استقبالی اس دوکان سے ہار خریدتا ہوا بیلا ڈ پیر کے استقبالی ہال میں داخل ہوجائے گا۔ ادھر یہ دل خوش کن تخیل آرائیاں تھیں اور خوب خوب خیالی پلاؤ پک رہے تھے ادھر قدرت اس استقبالی نظام کو درہم برہم کرنے کا تہیہ کرچکی تھی۔ دفعتاً بجلی کوندگئی، آنکھوں میں چکاچوند آگئی۔ ایک ایک بچے کی زبان پر چرچا تھا کہ ''اسی جہاز سے گاندھی جی

آرہے ہیں۔''

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے اختتام کے بعد گاندھی جی راستے میں جگہ جگہ قیام کرتے ہوئے ہندوستان واپس آرہے تھے اور پورٹ سعید سے شہزادوں اور ان کی دلہنوں کے اسی جہاز میں سوار اور براجمان ہو گئے۔ اب سارا بمبئی صبح منہ اندھیرے ہی ان کا سواگت کرنے کے لئے الٹ پڑا اور احمد آباد، سورت، کاٹھیاواڑہ، پونہ، مہاراشٹر وغیرہ وغیرہ مضافاتی علاقوں سے راتوں رات جس قدر درشنی آسکتے تھے وہ بھی بیلاڈ پیر پر آدھمکے۔ حیدرآبادی قافلے کے لاکھ دو لاکھ افراد تک کے تو بیلاڈ پیر اس کا ہال اور اطراف متحمل ہو سکتے تھے۔ لیکن گاندھی جی کے ٹڈی دل استقبالیوں کو کیسے برداشت کیا جاسکتا تھا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ حیدرآباد کے دوڈیڑھ لاکھ استقبالی گاندھی جی کے چھ سات لاکھ استقبالیوں کے اروب میں آگئے اور آٹے میں نمک کی طرح تحلیل ہو کر اس اژدہام میں کھو گئے۔ کیسے ہار پھولوں کی مالائیں۔ اور کیسا استقبال و خیر مقدم! بھیڑ کا عالم یہ تھا کہ بیلاڈ پیر اور ہال تو ایک طرف رہا ساری سڑکوں، شاہراہوں، میدانوں، پارکوں کی پہنائیاں اور وسعتیں تنگ ہو گئیں اور حشرات الارض سے پٹ گئیں۔ مالاؤں کی دکان نگاہوں سے اوجھل اور منقطع ہو کر رہ گئی۔ کس کو ہوش تھا کہ بھیڑ کو چیر کر اپنی جان جوکھوں میں ڈالے اور دوکان تک پہونچ کر جیتی جان کے بدلے ہار خریدے! وہاں دوکان محبوب کی کمر بن کر رہ گئی تھی اور ''کہاں ہے، کس طرف ہے اور کدھر ہے'' کی صدائیں اگر بلند ہی ہوتی ہوں گی تو اس ہنگامۂ دار و گیر میں ان کا سننے والا کون تھا؟ اگر دوکان کا پتہ چل جاتا تب بھی وہاں پہونچ کر ہار خریدنا، پھر ہال تک پہونچنا اور اس کو دولہا دلہنوں کے گلے کا ہار بنانا تو ایک طرف، وہاں تو دولہا دلہن ہی لاپتہ اور یوسف بے کارواں بن کر رہ گئے تھے۔ سارے ہال اور گردو پیش پر گاندھی جی اور ان کے چیلوں کا مخالفانہ قبضہ تھا اور وہاں دلہنوں اور شہزادوں کے خیر مقدم کے بجائے گاندھی جی کا سواگت کیا جارہا تھا۔ پھولوں کی مالاؤں کے بجائے گاندھی جی پر کچے سوت کی لچھیاں نچھاور ہو رہی تھیں۔ بہت دیر بعد پتہ چلا کہ صورت حال کی نزاکت کے پیش نظر شہزادوں اور دلہنوں کو کسی دوسری اجاڑ سمت سے بدقت نکال کر دور تک پیدل چلا کر کرایے کی ٹیکسیوں کا انتظام کر کے غیر آباد راستوں سے والکیشر نظام پیلس تک

پہونچایا گیا جہاں محدود تعداد میں چند خاص خاص اور بلند پایہ افراد کے ذریعہ استقبال و خیر مقدم کا فرض کفایہ ادا کیا گیا۔ جب تک یہ بھیڑ بھاڑ رہی بے چارے گل فروش متحیر و گم سم رہے

آشیاں جلتا رہا اور باغباں دیکھا کیے

جب ہوش میں آئے اور حواس بجا ہوئے تو میدان خالی تھا۔ جہاں انسانوں کا سمندر موجیں مار رہا تھا وہاں ہو کا عالم تھا۔ اب یہاں گل فروش تھے، مالاؤں کے ہوٹل خالی کرنے کا تقاضہ اور مطالبہ۔ سارے گل فروش مالاؤں کے انبار کو وہیں انبار تھے اور مالکان ہوٹل کی طرف سے بقیہ رقم کرایہ کی ادائیگی اور جلد سے جلد چھوڑ کر روتے پیٹتے شہر کی جانب چل پڑے۔ جس شخص نے ان کی طرف آنکھ اٹھادی اس سے وہ اپنی پپتا کہنے لگ گئے۔ ان سے ہمدردی سب کو ہوئی اور کر کوئی کچھ بھی نہ سکا۔ یہ وقت وہ تھا جبکہ خلافت کمیٹی دم توڑ رہی تھی۔ تحریک خلافت مصطفےٰ کمال پاشا کے الغائے خلافت کے بعد بستر علالت پر دراز تھی اور روز بہ روز مضمحل ہوتی چلی جارہی تھی۔ تاہم چند مقامات پر اس کا اثر باقی تھا اور تحریک میں کام کرنے والے تحریک کے اضمحلال کے باوجود اپنے مخلصانہ کردار اور حاجت روا و ہمدرد خلائق ہونے کی وجہ سے پبلک کی نگاہوں میں معزز و موقر تھے۔ خاص کر بمبئی شہر، حسین شہید سہروردی کے کلکتہ اور میرے وطن اجمیر شریف میں اس کا اثر و نفوذ صاف صاف دیکھا جاسکتا تھا۔ اس اثر کی نوعیت کے بعض پہلو بڑے عجیب و مضحک بھی تھے، مثلاً اگر بارش نہیں ہوئی ہے، سخت گرمی پڑ رہی ہے، قحط کے آثار ہیں تو لوگ محلوں سے میٹنگ کر کر کے خلافت میں آتے تھے اور ہم سے بڑی سنجیدگی کے ساتھ شکایتی لہجے میں باضابطہ مطالبہ کرتے تھے کہ صاحب گرمی کی شدت سے پبلک پریشان ہے، قحط کا اندیشہ ہے، آپ یہاں کیا کرتے رہتے ہیں؟ آپ سے اتنا نہیں ہوسکتا کہ پانی برسوا دیں؟ اجمیر شریف میں اتفاق سے دو ولی صفت بزرگ ایک دن ایک ہی وقت میں انتقال کر گئے۔ دونوں کی تجہیز و تکفین کا وقت قریب قریب ایک ہی تھا اور دونوں کی تدفین علیحدہ علیحدہ قبرستانوں میں بیک وقت ہونی تھی۔ یہ صورت حال بلائے جان بن گئی۔ ایک گلخن افروز (چنے بیچنے والا بھڑ بھونجا) سرِ بازار گلے پڑ گیا اور چلا چلا کر بڑے کرخت لہجے میں کہنے لگا کہ ''بس صاحب بس! دیکھ لیا آپ خلافت والوں کو، بڑے لیڈر بنے پھرتے ہیں۔'' اس دوران

میں ہمارے گرد ایک اچھی خاصی بھیڑ جمع ہوگئی۔ میں نے اس خوف سے کہ ممکن ہے ہم میں سے کسی سے کوئی سنگین اور شرمناک قسم کا جرم سرزد ہوگیا ہو اور علانیہ سربازار افشا کر کے یہ بھڑ بھونجا عزت کے ٹکے کر ڈالے بڑے ملائم انداز میں ڈرتے ڈرتے اس سے خفگی کی وجہ اور اپنا قصور دریافت کیا۔ کہنے لگا ''صاحب، یہ دونوں بزرگ ایک وقت کیسے مر گئے؟ اب ہم دونوں کے کفن دفن اور نمازِ جنازہ میں کیسے شریک ہوں؟ ایک سے تو ہم نامحروم (محروم کی بجائے نامحروم اسی کی اپج ہے) ہی رہ جائیں گے۔ آپ سے اتنا بھی نہ ہوسکا کہ ان کے مرنے کا وقت آگے پیچھے کر دیتے۔''

اس کی لن ترانی سن کر لوگ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوگئے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور ان الفاظ میں معذرت کر کے پیچھا چھڑایا کہ اس دفعہ غفلت کو معاف کرو آئندہ ایسی باتوں کا خیال رکھا جائے گا۔ ہاں تو عرض یہ کر رہا تھا کہ خلافت والے اپنے ایثار اور محیر العقول کارناموں کی وجہ سے پبلک کے دلوں میں اس قدر اتر گئے تھے کہ ان کو قضا و قدر کے کارخانے میں دخیل سمجھ لیا گیا تھا ایسے ہی تاثرات کے ماتحت کچھ لوگوں نے گل فروشوں کو مشورہ دیا کہ خلافت ہاؤس جاؤ، وہاں شاید کوئی صورت اور اس مشکل کا حل نکل آئے۔ میں خلافت کے دفتر میں اپنی نشست پر کام کر رہا تھا کہ پچیس تیس افراد پر مشتمل ایک انبوہ روتا پیٹتا دفتر میں داخل ہوا۔ ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ چیخ چیخ کر رو رہے تھے۔ کسی کے آنسو بہہ رہے تھے کسی کی آنکھیں خشک تھیں مگر صورت روہانسی بنی ہوئی تھی۔ دریافت کرنے پر ان لوگوں نے ساری داستانِ غم سنا ڈالی۔ ایک دو باتیں کہتے تھے اور بیچ میں کچھ کچھ رو بھی لیتے تھے۔ سب کچھ سننے کے بعد ہم سب حیران و سراسیمہ ہو کر رہ گئے اور دیر تک سوچ بچار کے بعد صرف یہی کہہ سکتے کہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔ ہمارے بس میں کیا ہے۔'' مایوسی کے یہ کلمات سن کر وہ لوگ اور بھی بے قرار ہوگئے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ وہ رو رہے تھے اور ہم حیران و ششدر ان کو دیکھ رہے تھے۔ اب یہاں سے داستان کا وہ حصہ شروع ہوتا ہے جو مقصود بالذات ہے اور جس کی خاطر تمہید ہی کے معلوم نہیں کتنے صفحات سیاہ کر دینے پڑے۔

جس دفتر خلافت میں گریہ وزاری کا کہرام پتا تھا اور تحیر و مایوسی کے بادل چھائے

ہوئے تھے ٹھیک اسی کے بالائی حصے میں علامۃ المشرق اقامت گزیں تھے۔ دفعتاً علامہ کی تصویر ابھری اور نگاہوں میں پھر گئی۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور ان لوگوں سے کہتا ہوا کہ ''ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں'' بالائی منزل پر پہنچ گیا وہاں علامہ اپنی حالت میں گم اور حسب دستور آنکھیں بند کئے کسی فکر میں غرق تھے میں نے قریب پہنچ کر قدرے اونچی آواز میں کہا ؎

خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

علامہ آنکھیں کھولیں فرمایا ''بیٹھو'' کیا بات ہے؟ میں نے گل فروشوں کی تمام کتھا ایک ہی سانس میں سنا دی اور یہ بھی ظاہر کر دیا کہ غالباً کل شام تک شہزادگان حیدر آباد روانہ ہو جائیں گے۔ ان کی اسپیشل تیار کھڑی ہے۔ علامہ نے قدرے تامل کیا۔ ہاتھ بڑھا کر میرے ہاتھ سے وہ مالائیں لے لیں اور ان کو بغور دیکھا۔ فرمایا ہار کتنی تعداد میں ہیں۔ میں نے عرض کیا لاکھ ڈیڑھ لاکھ ہوں گے یا کچھ کم وبیش'' فرمایا'' اسپیشل کتنی لمبی ہے میں نے کہا بڑی لمبی شیطان کی آنت ہے۔'' فرمایا کہ ان ہاروں سے پوری اسپیشل کو سجا کر دلہن کیوں نہ بنا دیا جائے؟'' میں علامہ کی ساری اسکیم سمجھ گیا جو ان کے دماغ میں آچکی تھی۔ میں نے تائید کی۔ ٹیلیفون کی طرف ہاتھ لہراتے ہوئے فرمایا'' فون قریب لاؤ'' اور سر اکبر حیدری سے ملا دو۔ میں نے قریب میز سے فون اٹھا کر علامہ کے قریب رکھا۔ رسیور اٹھا کر ڈائل گھمایا۔ سر اکبر حیدری کا اسپیشل نمبر مل گیا۔ اس طرف سے خود حیدری بول رہے تھے۔ علامہ نے ساری رام کہانی سنا کر فرمایا کہ حکومتِ نظام یہ سب ہار مقررہ قیمت پر خرید لے اور ان گلفروشوں ہی کو اس کی اندر باہر سے سجا دینے پر مامور کر دیا جائے۔ یہ اسپیشل بجائے خود ایک عجوبہ اور نئی چیز ہوگی۔ یہاں سے دکن تک کی فضائیں معطر ہوتی چلی جائیں گی اور ایک دلکش نظارہ اور اچھا تماشا رہے گا۔ سر اکبر نے علامہ کی بات بھی پوری نہ ہونے دی اور بڑی بے تابی سے کہا کہ ان گلفروشوں کو فوراً نظام پیلس بھیج دیا جائے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسپیشل کو سجانے کا مسئلہ سر اکبر کے زیر غور تھا کہ علامہ نے ان کی مشکل حل کر دی۔ میں نے نیچے پہنچ کر ان لوگوں سے کہا کہ ایک منٹ ضائع کئے بغیر نظام پیلس پہنچو اور سر اکبر حیدری سے ملو۔ یہ لوگ بھاگم بھاگ نظام پیلس جا پہنچے اور سر اکبر نے سارے ہاروں سے اسپیشل سجا دینے کے لئے ان لوگوں کو باضابطہ مامور کر کے آرڈر دے دیا۔

COMPLIMENTARY BOOK
National Council for Promotion
of Urdu Language

چار پانچ بجے شام سے تمام رات اور دن کے گیارہ بجے تک یہ لوگ اسپیشل سجاتے رہے اور واقعی اس کو دلہن بنا کر رکھ دیا۔ دوپہر دو بجے کے قریب سرا کبر آئے کام کو پسند کیا اور پوری قیمت اور سجائی کی اجرت اسی وقت چیک کے ذریعہ ادا کر دی۔ دوسرے دن صبح ہی صبح پانچ چھ ٹیکسیاں خلافت ہاؤس میں داخل ہوئیں۔ ان میں سے گلفروش نکلے اور مٹھائیوں اور فروٹس کے چند ٹوکرے بھی برآمد ہوئے۔ ان لوگوں نے یہاں پہنچ کر اور وفورِ محبت سے بے قابو ہو کر عجیب مجنونانہ حرکتیں کیں۔ خلافت ہاؤس کو سر پر اٹھا لیا۔ ہم لوگوں کو کندھوں پر بٹھا لیا۔ سروں، چہروں اور رخساروں کو چوم چوم کر گندہ کر دیا اور خواہش ظاہر کی کہ علامہ کی زیارت کرائی جائے، ان سے شرفِ ملاقات کا موقع بہم پہونچایا جائے۔ علامہ بدقت اس پر تیار ہو سکے کہ ہال کی کھڑکی کے سامنے آ گئے۔ سب کے سلاموں کا جواب دیا۔ فروٹ اور مٹھائیوں کے متعلق فرمایا کہ یہ غیر ضروری تکلیف اور تکلف کیوں کیا اور اتنا فرما کر اپنی جگہ جا بیٹھے۔ مٹھائی اور فروٹ میں سے بقدر قلیل ایک سینی میں سجا کر علامہ کی خدمت میں پیش کیے گئے جس پر آپ نے صرف غلط انداز نگاہ ڈالی۔ ان ماکولات کے ساتھ علامہ کی سرد مہری نے حاشیہ نشینوں کو سرگرم عمل کر دیا اور وہ سارا خوان چٹ کر گئے۔ فروٹس اور مٹھائیوں کے ٹوکروں پر خلافت کمیٹی، خلافت اخبار اور خلافت پریس کے کارکن ٹوٹ پڑے اور یہ ٹوکرے چشم زدن میں خالی ہو گئے اور حضرت اقدس خواجہ اعظم اجمیری نور اللہ مرقدہٗ کی دیگ لٹنے کا سماں آنکھوں میں پھر گیا۔

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی میں منعقدہ یومِ اقبال کے موقع پر ہندوستان کے موقر انگریزی روزنامہ ٹائمز آف انڈیا میں چھپی رپورٹ کا عکس

Celebrating Iqbal's love for Mumbai & his muse

Mohammed Wajihuddin | TNN

Mumbai: In 1905, before he sailed for Europe, the poet Allama Iqbal briefly stopped over in the city. From his hotel in Colaba, Iqbal strolled to Victoria Terminus and drifted to a leafy campus nearby where boys played cricket. "What is this building about?" Iqbal asked. "It's Anjuman-i-Islam, a school Muslims have founded," a boy replied. The poet complimented the city's love for education.

Over a century later, Anjuman-i-Islam has joined hands with the city to remember Iqbal (1873-1938) on his 70th death anniversary on April 21. Apart from a lecture on Iqbal's Mumbai connection, the audience will be treated to a rendition of his ghazals and nazams.

The creator of several stirring poems, including the patriotic *Saare Jahan Se Achcha*, Iqbal celebrated Mumbai's cosmopolitanism in verse. "Iqbal visited Mumbai four times. His conversation with local journalists and leaders show that he liked the city a lot," says Abdus Sattar Dalvi, director of Anjuman-i-Islam's Urdu Research Institute.

Pathar ki moorton mein samjha hai tu khuda hai/Khake watan ka mujhko har zarra devta hai

(You think god resides only in stone idols/But to me, every particle of the country's soil is a deity)

On his way to the Round Table Conference in London in 1932, Iqbal stayed at the Khilafat House in Byculla. When the editor of *Khilafat* asked if he had a message for their largely Muslim readers, Iqbal replied that he had: "Live harmoniously with your Hindu brothers."

One of Iqbal's patriotic poems is *Naya Shivala* (New Temple), which attacks fanatics among the Hindus and the Muslims. To the former, who accuse him of not loving the motherland, Iqbal says, "*Pathar ki moorton mein samjha hai tu khuda hai/Khake watan ka mujhko har zarra devta hai* (You think god resides only in stone idols/But to me, every particle of the country's soil is a deity)".

Lofty ideals like multiculturalism apart, Iqbal loved Mumbai for a very personal reason: his beloved, Atia Faizi, lived here. Faizi, an Urdu writer whom Iqbal met at Cambridge, had completely charmed the poet with her beauty and intelligence. The numerous letters they exchanged are a testimony of Iqbal's love for her. "Once Atia threw a lavish party in Iqbal's honour at her Malabar Hill home. The two were seen sharing jokes and laughing a lot," says Dalvi who is planning a new book on Iqbal.

Proud of his Kashmiri Brahmin roots, Iqbal is known to have introduced a new rhythm in his prolific body of Urdu and Persian work. After Partition, Pakistan tried to hijack Iqbal, hailing him as their founder-thinker. The airport in Lahore and numerous other monuments are named after him. But many political scholars, including the late Rafiq Zakaria, have repeatedly said that Iqbal was not pro-Partition and that he died in 1938 before the idea of Pakistan became popular. Zakaria had said while it is true that in a 1930 speech the poet did propose a separate Muslim province within the Indian federation—the key word was 'within' the federation.

"Iqbal never supported the two-nation theory," says Urdu poet-critic Fuzail Jafri. "But many so-called experts in Pakistan wrongly credit the poet with the idea of Pak[illegible]

mohammed.wajihuddin[illegible]

1386

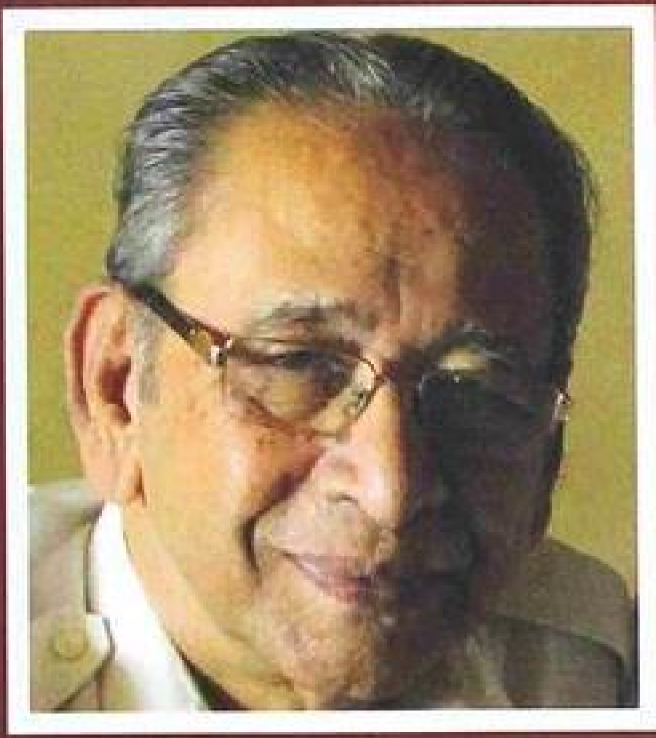

پروفیسر عبدالستار دلوی کا شمار اسماعیل یوسف کالج، ممبئی کے سابق طالب علم اور پروفیسر نجیب اشرف ندوی کے ممتاز شاگردوں میں ہوتا ہے۔ وہ مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر (ممبئی) کے بانی ڈائریکٹر، کرشن چندر پروفیسر و صدر شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی، پروفیسر و بانی شعبۂ اردو، عین شمس یونیورسٹی، قاہرہ (مصر)، مہمان پروفیسر حیدرآباد یونیورسٹی اور مشیر (Advisor) مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (حیدرآباد) کی حیثیت سے خدمات انجام دے چکے ہیں۔ لسانیات، ادب، تراجم اور مسلمانوں کی تہذیبی تاریخ ان کے مطالعے کے خاص موضوعات ہیں۔ 'اقبال کا ایک ممدوح - بھرتری ہری'، 'اردو زبان اور سماجی سیاق'، 'دو زبانیں - دو ادب [اردو اور ہندی کے تناظر میں]'، 'علی سردار جعفری - شخص، شاعر اور ادیب'، 'پونے کے مسلمان' اور 'ساوتری' اور 'رن آنگن' (مراٹھی ناولوں کے تراجم) ان کی چند تصانیف ہیں۔ ڈاکٹر رفیق زکریا کی علامہ اقبال پر انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ 'اقبال شاعر اور سیاست داں' بھی ڈاکٹر دلوی کا رہینِ منت ہے۔ آج کل وہ انجمنِ اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی کے اعزازی ڈائرکٹر ہیں۔

...... پروفیسر عبدالستار دلوی نے ممبئی سے اقبال کے تعلق کے بارے میں تحقیق کی ہے جس میں بہت کچھ وہ ہے جواب تک لوگوں کو متوجہ نہیں کرسکا، اس معلومات کے ذریعے اُن کی نجی اور تخلیقی زندگی کی نشوونما سے متعلق کچھ کڑیاں مل جائیں گی۔ پروفیسر عبدالستار دلوی نے پہلے بھی اقبال کی شاعری، زندگی اور ان کے کلام کے تراجم پر اہم کتابیں شائع کی ہیں وہ اردو کے معروف مستند محقق اور ماہر لسانیات ہیں مگر اُن کی علمی دلچسپیوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اردو اور مراٹھی کے تعلق سے بھی ان کی تحریریں اور تراجم اہلِ علم قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی یہ کتاب اقبال سے دلچسپی رکھنے والوں کو متاثر کرے گی۔

- پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی